جلد (۷) عدد (۳)
رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

خاص مضمون
حقوق الزوجین نمبر ۱

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)
قیمت فی پرچہ ۸ر

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہوگئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع وبرید شروع کردی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کردیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول وقوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد وضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت [illegible] جلد ([illegible]) انگریزی ([illegible]) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت [illegible] انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ رمضان سنہ ۱۳۵۴ھ - جلد ۷ عدد ۳

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۶۲
مقالات:-		
مسلم سوسائٹی	جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز	۱۷۷
اجر رسالت	جناب مولانا عبیداللہ العمادی	۱۸۷
حقوق الزوجین	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۰۳
تنزیل و تاویل:-		
تفسیر سورہ کوثر (علامہ فراہی مرحوم)	ترجمہ جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی	۲۱۵
رسائل و مسائل:-		
سود، پردہ طلاق اور مہر	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۳۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اصول اور اساسی احکام میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اخلاق کے بلند نصب العین کو پیش نظر رکھتا ہے تو دوسری طرف انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک طرف وہ تمدنی و اجتماعی مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے تو دوسری طرف اشخاص کے حقوق بھی پامال نہیں ہونے دیتا۔ ایک طرف وہ واقعی حالات پر نگاہ رکھتا ہے تو دوسری طرف ایسے امکانات کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا جن کا کسی وقت عالم واقعہ میں آنا متوقع ہے۔ غرض یہ ایک ایسا معتدل قانون ہے جس کا کوئی قاعدہ اور کوئی حکم افراط و تفریط کی جانب مائل نہیں ہے۔ قانون سازی میں جتنے مختلف پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ان سب کا اس میں نظری حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عملاً پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، اور ان کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا گیا ہے کہ کہیں کسی ایک طرف نامناسب میلان اور کسی دوسرے پہلو سے غیر منصفانہ اعراض نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تیرہ سو برس سے یہ قانون مختلف ملکوں، مختلف زمانوں، مختلف تمدنی حالات، اور مختلف علمی مراتب اور مزاجی کیفیات رکھنے والی قوموں میں رائج رہا ہے، اور کہیں کسی شخصی یا اجتماعی تجربے نے اس کے کسی اساسی حکم کو غلط یا قابل ترمیم نہیں پایا۔ یہی نہیں بلکہ انسانی فکر باوجود وسعت بلیغ اس کی کسی چیز کا ایسا بدل تجویز کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکی جو اعتدال اور توازن اور تناسب میں اس کے

تک بھی پہنچتا ہو۔

یہ کیفیت جو اسلامی قانون میں پائی جاتی ہے، صرف الٰہی حکمت و بصیرت ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے کیونکہ انسان اپنے لازمی تقیدات اور اپنی فطری محدودیتوں کے ساتھ کبھی اس پر قادر ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے، حال اور مستقبل پر یکساں نظر رکھے، ما بالفعل اور ما بالقوہ پر ایک ساتھ نگاہ ڈالے، خود اپنی اور اپنے تمام ابنائے نوع کی فطرت کے چھپے اور ظاہر خصائص کا پورا پورا لحاظ کرے، اپنے ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد ہو جائے، اور اپنے جذبات اور طبعی رجحانات اور عقلی کوتاہیوں اور علمی نارسائیوں سے یکسر پاک ہو کر کوئی ایسا قاعدہ وضع کرے جو ہر حال اور ہر زمانے اور ہر ضرورت پر ٹھیک ٹھیک عدل اور مناسبت کے ساتھ منطبق ہو سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قوانین انسانی فکر پر مبنی ہوتے ہیں ان میں صحیح توازن نہیں ہوتا۔ کہیں نظریات میں بے اعتدالی ہوتی ہے، کہیں حکمت عملی میں نقص پایا جاتا ہے، کہیں اخلاق اور قانون کی آمیزش میں افراط و تفریط ہوتی ہے، کہیں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی رعایت میں کوتاہی کی جاتی ہے، کہیں اشخاص کے حقوق اور واجبات متعین کرنے میں عدل نہیں ہوتا، کہیں شخص اور جماعت کے درمیان حدود اور حقوق کی تقسیم میں بے انصافی ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ ہر نئے تجربے اور ہر تغیر حالت اور ہر بدلے ہوئے زمانے میں ایسے قوانین کی کمزوریاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں، اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ یا تو ان میں ترمیم کرے یا اعتقاداً ان کا متبع رہ کر عملاً ان کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔

الٰہی قانون اور انسانی قانون کے درمیان یہ بنیادی فرق آج اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ بجز اندھوں اور شپرہ چشموں کے ہر شخص اس کو دیکھ سکتا ہے۔ کل تک تعصب یا جہل کی وجہ سے اسلامی قانون کے جن احکام اور اصولوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کیے جاتے تھے اور ان کے مقابلے میں انسانی قوانین کے جن نظریات اور

قواعد پر فخر کا اظہار کیا جاتا تھا آج ان کے متعلق کسی بحث و استدلال کے بغیر محض واقعات ہی کی ناقابل انکار شہادت سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے کہ جو کچھ اسلام نے سکھایا تھا وہی صحیح تھا۔ اس کے خلاف جتنے طریقے انسانی قوانین نے تجویز کئے تھے وہ سب غلط اور ناقابل اتباع نکلے اگرچہ عالم تخیل میں وہ بہت ہی درخشاں نظر آتے تھے۔ زبانیں اب بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ مگر عملاً دنیا اُن قوانین کو توڑ رہی ہے۔ جن کو کل تک وہ نہایت مقدس اور ناقابل ترمیم سمجھتی تھی اور آہستہ آہستہ ان اُصول و قواعد کی طرف رجوع کر رہی ہے جو اسلام نے مقرر کیے تھے لیک بعد از خرابی بسیار۔

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلہ کو لے لیجیے جس پر ابھی چند سال پہلے تک مسیحی دنیا مسلمانوں کو کیسے کیسے طعنے دیتی تھی؟ اور بہت سے مرعوب مسلمانوں کو شرمندگی کے مارے جواب بن نہ آتا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ازدواج کے مقدس رشتے کو ناقابل انقطاع قرار دینا اور قانون میں طلاق و خلع اور فسخ و تفریق کی گنجائش نہ رکھنا مسیحیت کا کوئی حکیمانہ فعل نہ تھا، بلکہ محض انسانی فکر کی بے اعتدالی کا نتیجہ تھا، اور اس میں اخلاق و انسانیت اور نظام تمدن کی فلاح نہیں بلکہ تباہی کے اسباب مضمر تھے۔

مسیح کے یہ الفاظ کس قدر شاندار ہیں کہ:۔

"جسے خدا نے جوڑا اسے آدمی جدا نہ کرے" (متی ۱۹: ۶)

مگر اس قول کو اخلاقی اصول کی حد سے نکال کر قانون ازدواج کی اساس بنانے کا انجام کیا ہوا؟ مسیحی دنیا صدیوں تک اس ناقابل عمل قانون کے خلاف حیلوں اور مکر و فریب کے ساتھ عمل کرتی رہی، پھر خلاف ورزی قانون کی عادت بڑھنے سے اتنی ترقی کی کہ جو اخلاقی حدیں رشتہ ازدواج سے زیادہ مقدس تھیں ان کو بھی بکثرت اور علانیہ توڑا جانے لگا آخر کار افسوں نے مجبور ہو کر اس قانون میں چند جزوی اور ناقص ترمیمیں کیں جس کو وہ غلطی سے خدا کا قانون سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ "صلاحی قدم" اس وقت

اٹھایا گیا جب قانون شکنی کی عادت نے پیروانِ مسیح کے دلوں میں خدا کی جوڑی ہوئی چیز کا احترام باقی ہی نہ چھوڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان جزوی اور نہایت ناقص ترمیموں ہی کی بدولت مسیحی دنیا میں طلاق اور فسخ و تفریق کا ایک طوفان امنڈ آیا جس کی شدت سے نظام عائلی کی "مقدس" دیواریں پاش پاش ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ انگلستان جہاں سنہ ۱۸۷۰ء میں صرف ۱۶۶ تفریقیں ہوئی تھیں، وہاں سنہ ۱۹۳۲ء میں چار ہزار سے اوپر تفریقیں ہوئیں، یعنی خدا کے جوڑے ہوئے ہر ۹ ، رشتوں میں سے ایک کو آدمی نے جدا کر دیا۔ امریکہ جہاں سنہ ۱۸۶۷ء میں ۲۵ ہزار تفریقیں ہوئی تھیں وہاں سنہ ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ ۸۳ ہزار مقدس رشتے قطع کیے گئے فرانس میں تو اب قریب قریب ہر ۵ ا شادیوں کا انجام طلاق پر ہو رہا ہے۔ اور کم و بیش یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا بھی ہے۔

مسیح نے جو تعلیم دی تھی اس سے ملتی جلتی تعلیم قرآن میں بھی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (۲: ۳) مسیح نے یہودیوں کی سخت دلی اور طلاق کی کثرت کے خلاف نفرت دلانے کے لیے کہا تھا کہ "جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے" (متی ۱۹: ۹) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس غرض کے لیے اس سے زیادہ مچھے تلے الفاظ میں طلاق کو ابغض الحلال فرمایا اور نفس پرستی کی خاطر طلاق دینے والے کو ملعون ٹھیرایا۔ مگر یہ اخلاق کے بلند پایہ اصول محض اشخاص کی تعلیم کے لیے تھے تاکہ وہ اپنے عمل میں ان کو پیش نظر رکھیں نہ یہ کہ انھیں بجنسہٖ لیکر ایک قانون کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف معلم اخلاق ہی نہیں صاحب شریعت بھی تھے اس لیے آپ نے اصول اخلاق بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قانون میں ان اخلاقی اصولوں کی آمیزش کا صحیح تناسب کیا ہونا چاہیے اور اصول اخلاق و مقتضیات فطرت انسانی کے درمیان کس طرح

توازن قائم رہ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے مسیح علیہ السلام صاحب شریعت نہ تھے بلکہ صرف اس لیے آئے تھے کہ شریعت موسوی میں مکارم اخلاق کی وہ روح پھونک دیں جو بنی اسرائیل سے مفقود ہوگئی تھی، اس وجہ سے انھوں نے صرف اخلاقی اصول ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا جس سے مقصد یہ تھا کہ شریعت موسوی کے اتباع میں ان اصولوں کو مرعی رکھا جائے۔ مگر مسیحی یہ سمجھے کہ ان اصولوں کو پالینے کے بعد اب ہم الٰہی شریعت سے بے نیاز ہوچکے ہیں اور یہ خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ "چرچ" کا کام ہے کہ ان اصولوں کی بنا پر قوانین بنائے۔

یہ عظیم الشان غلط فہمی تھی جس نے چرچ اور اس کے متبعین کو ہمیشہ کے لیے گمراہی میں ڈال دیا۔ مسیحیت کی دو ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جتنے اصول دین بتائے تھے ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بھی کوئی صحیح قانون بنانے میں چرچ کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور آخر کار مسیحی قوانین ان اصولوں ہی سے انحراف کرنے پر مجبور ہوگئیں۔

مسیح نے طلاق کی جو برائی کی تھی اس میں "حرام کاری" کا استثنا کر کے گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ طلاق مطلقاً بری چیز نہیں بلکہ سبب جائز کے بغیر مبغوض ہے۔ مسیحی اس کو نہ سمجھے اور اوپر والی آیت "جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے" سے متعارض پا کر بعض نے تو یہ رائے قائم کر لی کہ یہ استثنا بعد کا اضافہ ہے اور بعض نے اس سے یہ مسئلہ نکال لیا کہ "حرام کاری" کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے مگر رشتۂ نکاح بدستور قائم رہے، اور دونوں میں سے کسی کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ ہو۔ صدیوں تک مسیحی دنیا اسی پر عمل کرتی رہی اور منجملہ دوسرے قوانین کے اس قانون نے بھی مسیحی قوموں کے اندر بد اخلاقی کی کافی اشاعت کی۔ لطف یہ ہے کہ چرچ کے اثر سے آزاد ہو جانے اور بالکل عقلی اصولوں پر قانون سازی کا ادعا کرنے کے باوجود انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں اب تک قانونی تفریق (Judicial Separation) کے معنی یہی سمجھے جاتے ہیں کہ زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔

مگر دونوں نکاح ثانی کے مجاز نہ ہوں۔ یہ ہے انسانی عقل کی کوتاہیوں کا حال۔

کلیسائے روم کے مذہبی قانون (Canon' Daw) میں مذکورہ بالا اصول کی بنا پر جو قواعد بنائے گئے تھے ان کی رو سے طلاق (Divorce) یعنی رشتۂ نکاح کا کامل انقطاع جس کے بعد زوجین کو الگ الگ نکاح کرنے کا حق حاصل ہو، قطعاً ممنوع تھا، البتہ تفریق کے لیے ۶ صورتیں تجویز کی گئی تھیں:- (۱) زنا یا جرائم خلاف وضع فطری (۲) خیانت (۳) ظالمانہ برتاؤ (۴) کفر (۵) ارتداد (۶) زوجین کے درمیان حرام خونی رشتوں میں سے کوئی رشتہ نکل آنا۔

ان چھ صورتوں میں جو قانونی چارۂ کار تجویز کیا گیا تھا اس کو کون عقل کے مطابق کہہ سکتا ہے؟ عدالت سے تفریق کا فیصلہ حاصل کرکے ہمیشہ تجرد کی زندگی بسر کرنا! یہ قانونی چارۂ کار نہیں بلکہ ایک سزا تھی جس کے خوف سے لوگ تفریق کے مقدمے ہی عدالتوں میں لے جاتے ہوئے ڈرتے تھے، اور اگر کسی قضا کے مارے جوڑے کی تفریق ہو جاتی تھی تو اسے لامحالہ یا تو راہبوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی، یا پھر مدت العمر حرام کاری میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔

اس شدید اور ناقابل عمل قانون سے بچنے کے لیے مسیحی علما نے بہت سے شرعی حیلے نکال رکھے تھے جن سے کام لے کر "چرچ" کا قانون ایسے بدنصیب زوجین کا نکاح فسخ کر دیتا تھا۔ منجملہ ان کے ایک حیلہ یہ تھا کہ اگر کسی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ زوجین نے مدۃ العمر ساتھ رہنے کا جو عہد کیا تھا وہ بلا ارادہ اُن سے سرزد ہو گیا تھا ورنہ دراصل ان کا مقصود محض ایک محدود مدت کے لیے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا (متعہ) تھا، تو اس صورت میں مذہبی عدالت انفساخ نکاح (Nullity) کا اعلان کر دے گی۔ مگر مسیحی قانون کی رو سے "انفساخِ نکاح" کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ زوجین میں کوئی نکاح ہی نہیں ہوا، اب تک ان کے درمیان ناجائز تعلقات تھے اور ان سے جو اولاد ہوئی وہ حرامی تھی! اس معنی کے لحاظ سے یہ دوسرا قانونی چارۂ کار

بھی کچھ کم خراب نہیں ہے۔

رومن چرچ کے بالمقابل مشرقی کلیسا (Orthodox Eastern Church) نے جس کو فقہ اسلامی سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ مواقع ملے ہیں نسبتہ ایک بہتر اور قابل عمل قانون بنایا ہے۔ اس کے نزدیک بند نکاح سے زوجین کو حسب ذیل وجوہ کی بنا پر آزاد کیا جا سکتا ہے۔

(۱) زنا یا اس کے مقدمات۔ (۲) ارتداد۔ (۳) شوہر کا اپنی زندگی کو قسیس کی حیثیت سے مذہبی خدمت کے لیے وقف کرنا۔ (۴) بغاوت۔ (۵) نشوز۔ (۶) عنانت۔ (۷) جنون (۸) برص و جذام (۹) طویل مدت کے لیے قید ہونا۔ (۱۰) نفرت باہمی یا شدید ناموافقت مزاج۔

لیکن مغربی ممالک کے مذہبی پیشوا اس قانون کو نہیں مانتے وہ کلیسائے روم کی فقہ پر ایمان لا چکے ہیں جس میں قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ رشتۂ نکاح بجز موت کے کسی اور چیز سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اب اس فتوے کے بعد ان کے لیے عقل سے کام لینا تو درکنار خود اپنے ہی دین کے ایک دوسرے مذہب فقہی پر غور کرنا بھی حرام ہے ۱۹۱۲ء کے رایل کمیشن کے سامنے بشپ گور (Bishop gore) نے مشرقی کلیسا کے بعض مسائل اخذ کرنے کی مخالفت محض اس حجت کی بنا پر کی کہ انگریزی چرچ رومن کلیسا کی فقہ کا پابند ہے۔ ۱۹۳۰ء کی (Lambeth Conference) میں بالفاظ صریح یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم کسی ایسے مرد یا عورت کا نکاح ہی نہیں پڑھا سکتے جس کا سابق شریک حیات ابھی زندہ موجود ہو۔ آخری اصلاح جس پر ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک مجلس (Joint Committee of Convocation) متفق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر نکاح سے پہلے کوئی فریق امراض خبیثہ میں مبتلا ہو، یا موروثی خرابیٔ دماغ یا نقص جسمانی کا شکار ہو، اور نکاح کے وقت اس کو دوسرے فریق سے چھپایا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور نکاح کے وقت اپنے شوہر سے اپنے حمل کو

مخفی رکھا ہو تو نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کے بعد ایسی کوئی صورت پیش آئے تو نہ عورت کے لیے مذہبی حیثیت سے کوئی چارہ کار رہے اور نہ مرد کے لیے!

یہ تو تھا مذہبی گروہ کا حال جس میں صدیوں تک پے در پے بڑے بڑے عقلا، علما، اور فقہا پیدا ہوئے، مگر ابتدا میں ان کے پیشواؤں سے مسیح علیہ السلام کے ایک ارشاد کا مفہوم اور اس کی قانونی حیثیت سمجھنے میں جو غلطی ہوئی تھی، اس کا اثر ان کے دل و دماغ پر ایسا گہرا جم گیا کہ امتداد زمانہ، تغیر احوال، علمی و عقلی ارتقاء، انسانی فطرت کا مطالعہ، سینکڑوں برس کے تجربات، خود صریح عقل کے فیصلے اور دوسرے بہتر قوانین کے نظائر، غرض یہ سب چیزیں مل جل کر بھی ان کو اس اثر سے آزاد نہ کر سکیں، اور دو ہزار برس کی طویل مدت میں بھی رومن چرچ کے بہترین دماغ اپنے قانون کا توازن درست کرنے اور اس کو اعتدال کے صحیح نقطے پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اب ذرا ایک نظر ان روشن خیال اور وسیع علم و تجربہ رکھنے والے واضعین قانون کے کارناموں پر بھی ڈال لیجیے جنھوں نے مذہبی قانون کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی قوموں کے لیے خود اپنے اجتہاد سے ازدواجی قوانین بنائے ہیں۔

انقلاب فرانس سے پہلے تک یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک میں رومن چرچ کا مذہبی قانون نافذ تھا، اور اس نے دوسرے ایسے ہی قوانین کے ساتھ مل کر مغربی قوموں کی معاشرت اور ان کے اخلاق کو بہت سی شدید خرابیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انقلابی دور میں جب آزادانہ تنقید اور آزادانہ تفکر کی ہوا چلی تو سب سے پہلے اہل فرانس نے اس قانون کے نقائص کو محسوس کیا اور یہ دیکھ کر کہ علمائے دین کسی طرح اس کی اصلاح پر آمادہ نہیں کیے جاسکتے، سرے سے اس کا جوا ہی اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔

(۱۷۹۲ء) اس کے بعد یہی ہوا دوسرے ممالک میں بھی چلی اور رفتہ رفتہ انگلستان، جرمنی، آسٹریا، بلجیم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، سوئیٹزرلینڈ وغیرہ نے مذہبی قانون کو چھوڑ کر اپنے اپنے جداگانہ قوانین نکاح وطلاق وضع کر لیے جن میں قانونی تفریق اور فسخ کے علاوہ طلاق کے لیے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طرح مسیحی اقوام کے ایک جم غفیر کا اپنے مذہبی قانون سے آزاد ہو جانا براہ راست نتیجہ ہے اس تنگ نظری جہل اور تعصب کا جس کی بنا پر مسیحی علما ایک ناقابل عمل، خلاف فطرت اور سخت مضرت رساں قانون کو جبراً محض مذہب کی طاقت سے مسلط رکھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا نہ تھا، محض چند انسانوں کے اجتہاد پر مبنی تھا، لیکن پادریوں نے اس کو خدائی قانون کی طرح مقدس اور ناقابل ترمیم قرار دیا، انھوں نے اس کی کھلی ہوئی غلطیوں، مضرتوں، اور خلاف عقل امور کو دیکھنے اور سمجھنے سے قطعی انکار کر دیا کہ کہیں سینٹ پال اور فلاں اور فلاں ائمۂ متقدمین کے نکالے ہوئے مسائل میں غلطی کا امکان ہی فرض کر لینے سے ان کا ایمان سلب نہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ انھوں نے خود اپنے دین کے ایک دوسرے فقہی مذہب سے بھی استفادہ کرنے کی مخالفت کی، نہ اس بنا پر کہ مغربی چرچ کا قانون مشرقی چرچ کے قانون سے بہتر ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کہ ہم "مغربی چرچ کے متبع ہیں"۔ مذہبی پیشواؤں کے اس طرز عمل نے مغربی قوموں کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ کار باقی ہی نہ رکھا کہ وہ ایسے قانون کی بندشوں کو توڑ پھینکیں جس کی غلطیاں اور مضرتیں ظاہر ہو جانے کے باوجود قابل اصلاح نہیں سمجھی جاتیں۔

ایک قانون ازدواج ہی پر کیا موقوف ہے دراصل یہی پادریانہ ذہنیت یورپ کی قوموں کو الحاد ودہریت اور لامذہبی کی طرف دھکیل کر لے گئی ہے۔

مذہبی قانون سے آزاد ہونے کے بعد مغربی ممالک میں گذشتہ ستر اسی سال کے اندر جواز دواجی

قوانین وضع کیے گئے ہیں ان کو بنانے میں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں دماغوں نے اپنی بہترین قابلیتوں کے ساتھ حصہ لیا ہے، اور نئے تجربات کی روشنی میں پے درپے ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کرتے رہے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے قوانین میں وہ توازن اور اعتدال پیدا نہیں ہو سکا ہے جو عرب کے ایک امّی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پیش کیے ہوئے قانون میں پایا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ مذہبی قانون سے آزاد ہو کر بھی وہ اپنے دل و دماغ کو ان تصورات سے اب تک پاک نہیں کر سکے ہیں جو انھیں رومن چرچ کے ابتدائی بانیوں سے وراثت میں ملے ہیں۔

مثال کے طور پر انگلستان کے قانون کو لیجیے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک وہاں صرف زنا اور ظالمانہ برتاؤ یہ دو ایسے وجوہ تھے جن کی بنا پر قانونی تفریق کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ طلاق جس کے بعد زوجین نکاح ثانی کے لیے آزاد ہوں اس وقت تک وہاں ممنوع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قانون میں مذکورۂ بالا دو وجوہ کے ساتھ نشوز احد الزوجین (Desertion) کو بھی ایک جائز وجہ تفریق قرار دیا گیا بشرطیکہ وہ دو سال یا اس سے زیادہ تک جاری رہا ہو۔ علاوہ بریں اسی قانون میں طلاق (یعنی عقدۂ نکاح سے قطعی آزادی) کو بھی جائز کیا گیا، مگر اس کے لیے لازم کر دیا گیا کہ مرد اگر طلاق چاہتا ہو تو وہ بیوی کا مرتکب زنا ہونا ثابت کرے۔ اور اگر عورت طلاق چاہتی ہو تو وہ شوہر کے ارتکاب زنا کے ساتھ ساتھ ظالمانہ برتاؤ یا نشوز بھی ثابت کرے۔ اس طرح گویا عورتوں اور مردوں کو مجبور کیا گیا کہ خواہ وہ کسی وجہ سے ایک دوسرے کو چھوڑنا چاہتے ہوں، بہرحال ان کو ایک دوسرے پر زنا کا الزام ضرور لگانا پڑے گا، اور ایک کھلی عدالت میں اس کا ثبوت دے کر ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے ایک فرد کی زندگی کو داغدار بنا دینا ہوگا۔ اس قانون نے زنا کے جھوٹے الزامات تراشنے کا دروازہ کھولا؛ عدالتوں کو سوسائٹی کے

تمام گندے کپڑے دھونے کی جگہ بنادیا، اور پھر عدالتہائے طلاق کے مقدمات کی اشاعت گویا بداخلاقی کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی۔ مزید براں اس قانون نے شوہروں کو دیوثی کی تعلیم بھی دی کیونکہ اس میں شوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کے ناجائز دوست سے ہرجانہ بھی وصول کرسکتا ہے، یعنی عورت کی عصمت کا معاوضہ! تمتع ناجائز کی قیمت جو قرمساقوں کا ذریعہ آمدنی ہوا کرتی ہے!

سنہ ۱۸۶۶ء کے قانون میں عدالت کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو نکاح کو توڑنے کے ساتھ ساتھ خطاکار شوہر پر مطلقہ عورت کے نفقہ کا بار بھی ڈال سکتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۷ء کے قانون میں شوہر کے خطاکار ہونے کی شرط اڑا دی گئی، اور عدالت کو مطلقاً یہ حق دیا گیا کہ جہاں مناسب سمجھے مطلقہ عورت کے نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ڈال دے۔ یہ عورتوں کے ساتھ کھلی ہوئی جانبداری ہے، اور یہاں صاف طور پر توازن بگڑا ہوا نظر آتا ہے جب عورت اور مرد کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو محض سابق تعلق کی بنا پر ایک غیر عورت کو ایک غیر مرد سے نفقہ دلوانا درانحالیکہ اس نفقہ کے بالمقابل اس مرد کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، نہ عقلاً درست ہے اور نہ اس کو مبنی بر انصاف کہا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۸۹۵ء کے قانون میں طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم و ستم کی وجہ سے اس کا گھر چھوڑ کر نکل جائے اور اس سے الگ رہے تو عدالت شوہر کو اس کے پاس جانے سے روک دے گی اور اسے نفقہ دلوائے گی۔ اور بچوں کو بھی اپنے پاس رکھنے کا مجاز قرار دے گی۔ اسی قانون میں یہ بھی طے کیا گیا۔ کہ اگر عورت اپنے شوہر کے برے برتاؤ یا تغافل کے سبب سے زنا کی مرتکب ہو تو اس کے خلاف طلاق کے لیے شوہر کا دعویٰ قابل سماعت نہ ہوگا! اس کے معنی پر غور کیجیے۔ شوہر کا ظلم ثابت کرکے عورت اس سے الگ جا رہے۔ شوہر کو پاس نہ پھٹکنے دے، خرچ کے لیے اس سے

روپیہ لے اور دوستوں کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھائے۔ پھر شوہر اگر ایسی عورت سے پیچھا بھی چھڑانا چاہے تو نہ چھڑا سکے۔ یہ ہے وہ قانون ازدواج جو انیسویں صدی کے آخری دور میں انگلستان کے بہترین دماغوں نے پچاس برس کی پے درپے محنتوں سے مرتب کیا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں طلاق اور ازدواجی معاملات پر غور کرنے کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس نے تین سال کی محنت کے بعد سنہ ۱۹۱۲ء کے اواخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) اسباب طلاق کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے یعنی جن وجوہ کی بنا پر مرد طلاق کی ڈگری پانے کا مستحق ہے، انہی وجوہ کی بنا پر عورت بھی طلاق حاصل کرنے کی مستحق ہو۔ مثلاً اگر شوہر ایک مرتبہ بھی زنا کا مرتکب ہو تو عورت اس سے طلاق لے سکے۔

(۲) طلاق کے سابق وجوہ میں حسب ذیل وجوہ کا اضافہ کیا گیا: تین سال تک چھوڑے رکھنا۔ بدسلوکی۔ ناقابل علاج جنون جب کہ اس پر پانچ برس گذر چکے ہوں۔ شرابی پن کی ایسی لت جس کے چھوٹنے کی امید نہ رہی ہو۔ وہ قید کی سزا جو سزائے موت سے معاف کرکے دی گئی ہو۔

(۳) شرابی پن کی بنا پر تین سال کے لیے زوجین میں تفریق کرائی جائے۔ اور اگر اس مدت میں یہ لت نہ چھوٹے تو ضرر رسیدہ فریق کو طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق ہو۔

(۴) نکاح سے قبل اگر کسی فریق کو جنون یا امراض خبیثہ میں سے کوئی مرض ہو اور دوسرے فریق سے چھپایا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور اس نے اپنا حمل مخفی رکھا ہو تو اس کو فسخ نکاح کے لیے کافی وجہ قرار دیا جائے۔

(۵) مقدمات طلاق کی رپورٹیں دوران مقدمہ میں نہ شائع کی جائیں اور بعد میں عدالت روداد کے جن حصوں کو شائع کرنے کی اجازت دے صرف انہی کو شائع کیا جائے۔

ان تجاویز میں سے صرف پہلی تجویز کو جو سب سے زیادہ نامعقول تھی قبول کر کے سنہ ۱۹۲۳ء کے قانون معاملات ازدواج (Matrimonial Causes Act) میں شائع کیا گیا باقی جتنی تجویزیں تھیں ان میں سے کسی کو بھی اب تک قانون کی صورت نہیں دی گئی، کیونکہ کنٹربری کے اسقف اعظم (Archbishop of Canterbury) اور بعض دوسرے بااثر لوگ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

انگلستان کے بہترین قانونی دماغوں کے تفقہ کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ وہ عورت اور مرد کے ارتکاب زنا کا قانونی اور فطری فرق تک سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی اس غلط قانون سازی کی بدولت عورتوں کی طرف سے اپنے شوہروں کے خلاف طلاق کے دعووں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ انگلستان کی عدالتیں ان سے پریشان ہو گئیں اور سنہ ۱۹۲۶ء میں لارڈ مری ویل (Lord Merrivale) کو ان کی روک تھام کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

یورپ کے جن ممالک میں رومن چرچ کا اثر زیادہ ہے وہاں اب تک رشتۂ نکاح ناقابل انقطاع ہے البتہ بعض صورتوں میں قانونی تفریق ہو سکتی ہے جس کے بعد نہ زوجین مل سکتے ہیں نہ آزاد ہو کر نکاح ثانی کر سکتے ہیں۔ آئرلینڈ اور اٹلی کے قوانین اسی قاعدہ پر مبنی ہیں۔

فرانس میں قانون ازدواج نے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ انقلاب کے بعد طلاق کو نہایت آسان کر دیا گیا۔ نپولین کے قانون (Code Napoleon) میں اس پر چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ سنہ ۱۸۱۶ء میں اس کو قطعاً ممنوع کر دیا گیا۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں پھر اسے جائز کیا گیا، اور اس کے بعد سنہ ۱۸۸۶ء، سنہ ۱۹۰۷ء اور سنہ ۱۹۲۴ء میں اس کے لیے مختلف قوانین بنائے گئے جن کی رو سے طلاق کے لیے حسب ذیل وجوہ قرار دیے گئے ہیں:۔ ۱ زوجین میں سے کسی کا ارتکاب زنا، ۲ ظالمانہ برتاؤ، ۳ احدالزوجین کا کوئی ایسا فعل جس سے

اس کے ساتھی کی عزت پر حرف آئے، حقوق زوجیت ادا کرنے سے انکار، شراب خواری کی لت، عدالت سے کوئی ایسی سزا پانا جو موجب ذلت ہو۔ علاوہ بریں عدالت سے طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عورت کے لیے تین سو دن کی عدت بھی مقرر کی گئی ہے جو اسلامی قانون کی ناقص تقلید ہے۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں قوانین طلاق ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ مگر ناقص اور غیر معتدل ہونے میں سب متفق ہیں۔ آسٹریا، بلجیم، سوئیٹزرلینڈ اور ناروے میں زوجین باہمی رضامندی سے طلاق کی ڈگری حاصل کرسکتے ہیں، یہ خلع سے ملتی جلتی چیز ہے مگر اس کی ناقص نقل ہے۔ جرمنی میں زوجین میں سے کسی ایک کا دوسرے کو چھوڑ دینا اور اس سے بے تعلق ہوکر رہنا موجب طلاق نہیں تاوقتیکہ یہ فعل مسلسل ایک سال تک جاری نہ رہے سوئیٹزرلینڈ میں اس کے لیے تین سال کی مدت ہے، اور ہالینڈ میں پانچ سال کی دوسرے ممالک کے قوانین اس باب میں ساکت ہیں۔ مفقود الخبر کے لیے، سوئیڈن میں ۶ سال کی مدت انتظار ہے اور ہالینڈ میں دس سال۔ دوسرے ممالک کے قوانین مفقود الخبر کے باب میں خاموش ہیں۔ مجنون کے لیے جرمنی، سوئیڈن اور سوئیٹزرلینڈ میں تین سال کی مہلت ہے باقی کسی ملک کا قانون مجنون کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ بلجیم میں مطلقہ کے لیے دس مہینے کی عدت ہے، فرانس اور بلجیم کے سوا کہیں عورت کے نکاح ثانی کے لیے مدت انتظار مقرر نہیں کی گئی۔ آسٹریا میں احد الزوجین کا پانچ سال یا اس سے زیادہ کی سزائے قید پانا دعوے طلاق کے لیے کافی ہے۔ بلجیم میں مجرد سزایاب ہونا عورت یا مرد کو اپنے رفیق کے خلاف طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق دار بنا دیتا ہے۔ سوئیڈن اور ہالینڈ میں اس کے لیے حبس دوام کی شرط ہے۔

یہ ان قوموں کے قوانین ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ان پر ایک نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ایک مکمل اور معتدل قانون بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کے مقابلے میں اسلامی قانون کو جو شخص انصاف کی نظر سے دیکھے گا اس کو تسلیم کرنا

پڑیگا کہ عدل، توازن، فطرت انسانی کی رعایت، فتنوں کے سد باب، اخلاق کی حفاظت، تمدنی مصالح کی نگہداشت، اور نزاع و ضرار کی تمام امکانی صورتوں کا علاج کرنے میں اسلامی قانون جس کمال کو پہنچا ہے وہ مغربی قوانین کو نہ صرف فرداً فرداً بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی نصیب نہیں ہوا، حالانکہ یہ قوانین انیسویں صدی کے "روشن" زمانے میں یورپ کے سینکڑوں ہزاروں علماء و عقلاء نے قریب قریب ایک صدی کے غور و خوض، چھان بین اور قانونی تجربات کے بعد وضع کئے ہیں، اور اُس قانون کو اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کا ایک اُمّی بادیہ نشین پیش کر گیا ہے جس نے اس قانون سازی میں کسی پارلیمنٹ، کسی کمیشن، کسی جماعتِ ماہرین سے مشورہ نہیں لیا۔

اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی کہتا ہے کہ اسلامی قانون خدا کا نہیں انسان کا بنایا ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ ایسے انسان کو تو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا۔ مگر اس کی صداقت کا اس سے زیادہ بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ایسے فوق البشری کارنامے کا کریڈٹ نہیں لیا اور صاف کہا کہ میں اپنے دل و دماغ سے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتا، جو کچھ مجھے خدا سکھاتا ہے وہی تم تک پہنچا دیتا ہوں۔

مقالات

مسلم سوسائٹی

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی

(۲)

(۱۰) انانیت۔

"جناب! اس تمام کامیابی کا ہمارے ہی سر سہرا ہے۔ اگر ہم یہ چال نہ سمجھاتے تو منہ کی کھائی ہوتی"۔ یعنی فضل ربانی، مشیت ایزدی، رحمت خداوندی کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ کسی دوسرے کی دوڑ دھوپ، تگ و دو کسی شمار میں نہیں، دنیا میں جو کامیابی ہوتی ہے، وہ بس انہی کی دانش الموالی کی بدولت، اور جسے ناکامی ہوتی ہے وہ محض اس لیے کہ وہ ان کے اشارے پر نہ چلا تھا۔ قرآن کریم نے جب ان اقوام کا ذکر کیا ہے جو برباد اور ہلاک ہوگئیں تو منجملہ دیگر امور کے یہ بھی فرمایا ہے کہ :۔

"جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے اور جب ہم اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میری تدبیر سے ملا ہے ...... یہ بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں سو ان کی کمائی ان کے کام نہ آئی ... $\frac{۳۹}{۴۹-۵۰}$"

یہی "میں" ہے جس کی وجہ سے انسان کے دماغ پر کبر و نخوت، فرعونیت تمرد کا بھوت سوار ہو جاتا ہے، اور پھر وہ کسی دوسرے انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتا، اور اس کا کوئی قدم زمین پر نہیں پڑتا۔

حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ یقیناً نہ تو تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو

الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۔ کُلُّ ذٰلِكَ اور نہ ہی اکڑ کر پہاڑوں کی بلندی تک پہنچ سکتے ہو۔ یہ
كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا۔ ۱۷/۳۸-۳۷ سب کچھ خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے اور گناہ ہے۔

اسی انانیت سے انسان میں وہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جسے ڈکٹیٹر شپ کہتے ہیں یعنے وہ کسی معاملہ میں کسی دوسرے کی رائے کو کچھ وقعت ہی نہیں دیتا کسی سے کبھی مشورہ نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو منزہ عن الخطا سمجھنے لگتا ہے۔ اپنے ہر لفظ کو قانون کی حیثیت دیتا ہے، اور اگر سمجھتا ہے کہ کوئی اور بھی اپنے دماغ میں عقل و فکر رکھنے کا مدعی ہے تو اسے مدعی نبوت کی طرح دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہے، حالانکہ باہمی مشاورت وہ چیز ہے جس کے لیے خاص طور پر تاکید کی گئی ہے کہ۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۳/۱۵۸ اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کیجیے۔

(۱۱) تقدس جتانا۔

"نہیں ابھی اب میں سوؤں گا۔ صبح تہجد کے لیے اٹھنا ہے۔"

استغفار سحری تیرے اور تیرے رب کے درمیان معاملہ ہے۔ اس کا اشتہار دینے سے کیا فائدہ لیکن یہ محض اس لئے ہوتا ہے کہ عام انسانوں سے اپنا مرتبہ بلند بتایا جائے۔ یہ مرض بھی اتنا عام ہو رہا ہے۔ کہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں حاجی، اور الحاج کی طرح نمازی اور المصلی بھی بطور لقب کے استعمال ہونا شروع نہ ہو جائے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۔ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا۔ ۴/۴۹ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو مقدس بناتے ہیں مگر اللہ جس کو چاہے مزکی (ومقدس) بنائے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

(۱۲) منافقت۔

یہ عنوان بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے لیکن اس وقت اس کے صرف ایک گوشہ پر روشنی ڈالی جائے گی جس کا تعلق سوسائٹی کی تعمیر و تخریب سے ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص تمام تجاویز میں آپ کے ساتھ

ہے، ہر معاملہ میں آپ سے متفق ہے۔ ہر مشورہ میں پیش پیش ہے لیکن درپردہ وہ بھانپتا رہتا ہے کہ کونسی پارٹی زیادہ طاقتور ہے اور کامیابی کس کے ساتھ ہے۔ عین وقت پر آپ دیکھتے ہیں کہ وہ میدان عمل میں آپکے ساتھ نہیں۔ اگر آپ کو ناکامی ہوئی تو کہتا پھرتا ہے کہ میں نے تو پہلے ہی کہدیا تھا۔ اور اگر کامیابی ہوئی تو کوئی عذر یار دہیش کرکے صفائی کرلی۔ یقین مانئے کہ اس "ایمان" سے وہ "کفر" ہزار درجہ اچھا جو ظاہر و باطن میں ایک ہو۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں یہ "ہرخوش کن" طبقہ منافقین کہلاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کا مقام اسفل السافلین طبقہ جہنم میں رکھا ہے۔ غداری وہ جرم ہے جو کبھی بخشا نہیں جاتا۔ وہ ہر مقام پر آپ کو اپنا دوست بتاتا ہے لیکن آپ کی تخریب و رسوائی میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ قرآن کریم میں سینکڑوں مقامات پر اس طبقہ کا ذکر ہے۔ فرمایا:۔

"بعض ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ تم سے بھی امن و امان میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔ جب کبھی ان کو شرارت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں پھر جا گرتے ہیں۔ سو یہ لوگ اگر تم سے کنارہ کش نہ ہوں۔ اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں۔ اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں۔ تو تم ان کو پکڑو۔ اور قتل کرو۔ جہاں کہیں پاؤ۔ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دیدی ہے۔" $\frac{۴}{۹۱}$

دوسری جگہ انہی کے متعلق ہے:۔

"اگر آپ کے لیے کوئی اچھی بات واقع ہوتی ہے تو ان کے لیے موجب غم بن جاتی ہے۔ اور اگر آپ پر کوئی حادثہ آپڑتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو اسی لیے پہلے ہی اپنی احتیاط کا پہلو اختیار کر لیا تھا۔ اور یہ کہکر خوش ہو کر چلے جاتے ہیں۔" $\frac{۹}{۵۰}$

پھر اگر یہ لوگ کبھی اس غداری میں نتھر کر سامنے آجاتے ہیں اور ان کو چھپنے کے لئے کوئی آڑ نہیں ملتی تو ہزار ہزار قسمیں کھا جاتے ہیں۔ یقین مانیے ان قسموں کی پرکاہ کے برابر بھی قیمت نہیں ہے

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ۶۳/۲ انہوں نے اپنی قسموں کو (اپنی حفاظت کے لیے) سپر بنا رکھا ہے۔

اور اگر اس پر بھی کام نہیں بنا تو جھٹ معافی مانگ لیتے ہیں اور اس کو بھی اپنی خوبی ظاہر کرتے ہیں کہ دیکھیے میں ضدی نہیں ہوں اگر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے غلطی کی ہے تو اعتراف قصور میں مجھے کبھی تامل نہیں ہوتا۔ یہ وہ حربہ ہے کہ جس کا جواب ہی نہیں۔ آپ اگر معاف نہ کریں دل سے نہ بھلائیں تو ساری دنیا آپ کو بدنام کرے گی۔ حالانکہ اگر آپ حقیقت پر غور کریں تو واضح ہو جائیگا کہ اس سے سہل ترکیب اور ہے ہی کوئی نہیں۔ جب تک جی چاہے عمداً اور ارادةً ایک شخص کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہیے۔ اس کی تذلیل وتحقیر میں ہر ممکن ذریعہ استعمال کر دیجیے اس کو نقصان پہونچانے کی در پردہ کوشش کیجیے اور جب کبھی دو شریف آدمیوں کے سامنے بات ہو تو جھٹ سے معافی مانگ لیجئے۔ آپ مومن کے مومن اور یہ نہ ماننے والا ضدی اور ہٹ دھرم۔ لیکن دیکھیے قرآن کریم نے قبول توبہ، عفو ودرگذر کے لیے کیا شرط عائد کی ہے۔ فرمایا:-

اِنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۵۴/۶ جو شخص تم میں سے بے سمجھے بوجھے کوئی برا کام کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اپنے آپ کی اصلاح بھی کرلے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

تین شرطیں ہیں۔ قصور بے سمجھے بوجھے سرزد ہوا ہو نہ کہ جان بوجھ کر۔ توبہ دل سے کرے۔ پھر اپنی آیندہ روش سے ثابت کر دے کہ اس نے فی الواقع اصلاح کر لی ہے۔ تو معافی مل سکتی ہے۔ نہ یہ کہ دانستہ دوسرے کی تذلیل پر کمر باندھے رکھی۔ ہمیشہ غداری کی اور جب پکڑے گئے تو جھٹ معافی مانگ لی یعنی یہ ایسا کبیرہ ہے کہ اسلام میں اس کی کہیں گنجایش نہیں قتل بھی اگر جہالت سے ہو جائے تو اس کی معافی ہو سکتی ہے لیکن وہ اگر عمداً ہو تو فجزاؤہٗ جہنم۔ دوزخ سے ورے ٹھکانا نہیں۔ اور اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ

منَ الْقَتْلِ۔ فتنہ پردازی تو قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ اگر یہ ارادۃً ہو تو اس کی معافی کیسی! خدا نہ کرے کہ کسی کو ایسے دوست مل جائیں۔

۱۳۔ استہزاءِ دینی۔

"مولانا کہاں ہیں بھئی"۔

"وہاں ہوں گے کسی گوشے میں۔ مُدرا ایکسر سائز میں جُتے ہوئے۔"

تعلیم یافتہ طبقہ سے قوم کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں لیکن ہمارے تعلیمیافتہ، روشن خیال طبقہ کی کسی محفل کا نظارہ دیکھیے، خدا، رسول، قرآن، حشر، نشر، دوزخ، جنت۔ نماز، روزہ، غرض اسلام کے عقائد اور شعائر میں سے ایک ایک پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں۔ فقرے صرف ہو رہے ہیں قہقہوں کے شور سے فضا گونج رہی ہے۔ پکلے کا کوئی نظریہ۔ ہزار غور و فکر کے بعد بھی سمجھ میں نہ آئے تو اپنا قصور فہم اور اس کی رفعتِ تخیل۔ مگر مذہبی شعار کی کوئی لِم سرسری نظر میں بھی اپنے مذاق پر پوری نہ اترے تو نہ صرف ناقابل تسلیم بلکہ ہدفِ استہزاء و تمسخر۔ حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

"اور اللہ تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا ہے کہ جب احکام الٰہی کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا سنو تو ان لوگوں کے پاس بھی نہ بیٹھو جب تک وہ کوئی اور بات شروع نہ کر دیں کیونکہ ایسی حالت میں تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے"۔ ۴/۱۴۰

دوسری جگہ ہے۔

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جا۔ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں، اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے لوگوں کے پاس مت بیٹھ"۔ ۶/۶۸

اور ایسے لوگوں سے ربط و تعلق رکھنا تو کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ فرمایا:۔

عله مُدرا نامی ایک صاحب نے ورزش کے کچھ طریقے وضع کئے ہیں جن میں جسم کو اوپر نیچے کیا جاتا ہے ہمارے روشن خیال طبقوں میں انگریزی ایکسرسائز کے نام سے یاد کی جا

"اے ایمان والو۔ اہل کتاب میں سے وہ لوگ جو تمہارے دین سے ہنسی مذاق کریں اور کفار اُن کو دوست مت بناؤ۔ $\frac{۵۷}{۵}$

دوستی کن سے رکھو؟

تمہارے دوست تو اللہ اور اس کے رسول، اور وہ ایماندار لوگ ہیں جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اور ان میں خشوع ہوتا ہے" $\frac{۵۵}{۵}$

۱۴۔ تعاون وعدم تعاون۔

"بھائی! میں یہ خوب سمجھتا ہوں کہ تم حق پر ہو لیکن چونکہ ان کے ساتھ میرے تعلقات ہیں اس لیے میں تمہاری مدد نہ کروں گا۔ ساتھ تو میں انہی کا دوں گا"

حالانکہ قرآن کریم کا فرمان ہے کہ۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ $\frac{۲}{۲}$

نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ اور گناہ اور سرکشی کے معاملہ میں ایک دوسرے سے تعاون مت کرو۔ اور ڈرو صرف اللہ ہی سے۔

۱۵۔ سرگوشیاں۔

"دیکھو بھئی پارٹی کی عزت کا سوال ہے، یہ بات باہر اس وقت نکلے جب وہ جیل جا پہنچے"

محض پارٹی کی ناک رکھنے کی خاطر ایک بھائی کے خلاف یہ خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ اور چونکہ جو ذرائع استعمال کیئے جائیں گے ان میں جائز و ناجائز کا سوال ہی باقی نہیں اس لیے یہ باطنی فدائیوں کی قسم کا جلسہ کیا جا رہا ہے، برعکس اس کے قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ

اے ایمان والو کبھی گناہ اور سرکشی اور معصیت رسول کے لیے سرگوشیاں مت کیا کرو۔ اور ہمیشہ نیکی اور تقوی

وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ ۵۸/۹

کی سرگوشیاں کیا کرو۔ اور اس اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تم کو جانا ہے۔

۱۶۔ رواج یا شریعت۔

جج۔ "تمہارا فیصلہ رواج کے مطابق کیا جائے۔ یا شریعت کے مطابق"

مدعی۔ "صاحب رواج کے مطابق۔ ہمارے ہاں شریعت کا دستور نہیں"

یہ سنا آپ نے کہ شریعت پر ترجیح دینے والے کون صاحب ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کے خدا کا ان کو حکم ہے کہ :۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۵۹/۴

اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع پڑ جائے تو اُسے (تصفیہ کے لیے) خدا اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ رواج کیا بلا ہے؟ وہی دستور و مراسم جن کی پابندی کفر کے زمانے میں ان کے آباواجداد کرتے تھے، یا جن کو اسلام کے زمانے میں ان کے جاہل اسلاف نے جاری کیا تھا۔ قرآن کریم نے کفار کی یہ صفت بیان کی ہے کہ :۔

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ خواہ ان کے باپ دادا نہ سمجھ رکھتے ہوں نہ ہدایت" ۲/۱۷۰

بعینہٖ یہی بات آج وہ مسلمان کہتے ہیں جو رواج کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان ہوتے ہوئے اسلام کے خلاف فیصلہ طلب کرنا کہاں کا اسلام ہے۔ انہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا تھا کہ۔

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو

آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور جو آپ سے قبل نازل کی گئی ہیں۔ مگر اپنے مقدمات شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کو حکم ہوا ہے کہ اس کو نہ مانیں، اور شیطان ان کو بہکا کر گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے" ۴/۶۰

غیر مسلم عدالت تو انہیں اجازت دیتی ہے کہ اگر یہ چاہیں تو ان کا فیصلہ شریعت الٰہی کے مطابق کیا جائے اور یہ مسلمان ہونے کے مدعی شریعت کے خلاف رواج مانگتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر قیامت اور کیا ہوگی

متفرقات۔

حکایت دراز تر ہوگئی اس لیے اب چند اور خصوصیات مختصراً عرض کر دی جاتی ہیں، جو اسلامی کیرکٹر کی جزئیات میں سے ہیں۔

(۱) خرچ میں میانہ روی اختیار کرو۔ نہ اسراف کرو نہ بخل ۱۷/۲۵-۲۹

(۲) پورا تولو اور وعدہ پورا پورا دو۔ ۱۷/۳۵

(۳) برائی کو نیکی سے دفعہ کرو۔ ۲۳/۹۶ ظلم کا بدلہ لے سکتے ہو لیکن برابر کا۔ زیادتی نہ کرو اور اگر معاف کر دو تو اور بھی اچھا ہے۔ ۱۶/۱۲۶ و ۴۲/۳۹-۴۳

(۴) ماننے والے کے سامنے جھک جاؤ منکر کے آگے سخت گیر ہو جاؤ۔ ۵/۵۴

(۵) فحش کاری خواہ علانیہ ہو خواہ پوشیدہ سب حرام ہے ۷/۳۳ جب چلو تو آنکھیں نیچی کر کے چلو ۲۴/۳۰ کیونکہ خدا آنکھ کی خیانت سے بھی واقف ہے ۴۰/۱۹

(۶) چھوٹی چھوٹی چیزیں دینے میں تنگ دلی سے کام نہ لیا کرو۔ ۱۰۷/۷

(۷) توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک باتوں کا حکم کرنے والے، بری باتوں سے روکنے والے اور حدود اللہ (قانون الٰہی) کی حفاظت کرنے والے، ایسے مومنین کو خوش خبری سنائیے ۹/۱۱۲

(۸) منویات سے منہ پھیرنے والے، وعدہ وفا کرنے والے $\frac{23}{1-2}$

(۹) بغیر اجازت لیے دوسرے کے گھر میں نہ جایا کرو۔ جب کسی کے ہاں جاؤ تو اہل خانہ کو سلام کیا کرو۔ اور اگر اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ آیا کرو۔ $\frac{24}{27-28}$

(۱۰) مسلمانوں کے دو گروہوں میں لڑائی ہو جائے تو صلح کرا دیا کرو۔ پھر ان میں سے اگر ایک گروہ زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے پھر اگر رجوع ہو جائے تو دونوں کے درمیان عدل سے صلح کرا دو اور انصاف کا خیال رکھو اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ $\frac{29}{9}$

(۱۱) ایک دوسرے کی ہنسی مت اڑاؤ۔ عیب جوئی مت کرو۔ ایک دوسرے کے برے نام مت ڈالو۔ بدگمانیوں سے بچا کرو۔ کیونکہ بعض بدگمانیاں (واقعی) گناہ ہوتی ہیں۔ اور دوسروں کی ٹوہ مت لگاتے رہا کرو۔ نہ کسی کی غیبت کرو $\frac{29}{11-12}$

اب آخر میں یہ بھی سنتے جائیے کہ رسول اللہؐ کے نزدیک مسلمان کی تعریف کیا ہے۔ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا۔

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔"

دوسری جگہ ہے۔ "ایک مسلمان کا خون۔ مال۔ اور آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے"

خدا اور رسول کے ان ارشادات مقدسہ کو سامنے رکھیے اور۔ باز بجویشتن نگر۔ پھر دیکھیے کہ ہماری سوسائٹی میں آج کون کون سے عیوب موجود ہیں، اور صحیح اسلامی سوسائٹی کی وہ کون کون سی خصوصیات ہیں جن سے یہ عاری ہے یقین مانیے کہ قومی فلاح وبہبود کے لیے جس قدر کوششیں کی جا رہی ہیں وہ کتنی ہی مبارک ومسعود کیوں نہ ہوں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں جب تک مسلمانوں کی اجتماعی تشکیل حیات ان خطوط پر نہ ہوگی جو قرآن کریم اور اسوۂ نبی اکرمؐ نے تجویز فرمائے ہیں! ایک دفعہ مسلم سوسائٹی ان خطوط مستقل پر

مشکل ہو جائے تو پھر دیکھیے کہ مسلمان کس طرح اس شجر طیب کی طرح کہ۔

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ جس کی جڑیں مضبوط جمی ہوئی اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔

دین و دنیا کے معاملات میں برومند و بارآور ہوتے ہیں۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب ونم درکش
پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ می جوئی۔ (اقبال)۔

مراۃ المثنوی

مرتبہ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ۔

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جنکی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایسی سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ کاغذ کتابت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت ؏ انگریزی للعہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

اجرِ رسالت

از جناب مولٰنا عبداللہ العمادی

(۱)

"اُجُر" اور "اُجرت" دونوں یکساں ہیں، ایک ذرا سا فرق یہ ہے کہ ثواب آخرت کے لیے اَجر اور اعمال دنیا کے بدل و عوض کو اجرت کہتے ہیں۔

دنیا اجرا اعمال و مزد کردار کی خوگر ہے، جو کام کرتی ہے اجرت کے لیے کرتی ہے، جو بوجھ اٹھاتی ہے اس کی مزدوری مانگتی ہے، صدیوں پیشتر خواجہ شیراز نے اس کے اصول بھی مرتب کر دیے تھے کہ

هر عمل اجرے و ہر کردہ جزاے دارد

اگرچہ خود اپنی حد تک اُنہیں یہی شکایت رہی کہ۔

ہر خدمتے کہ کردم بے مُزد بود و منت
یارب مباد کس را مخدوم بے عنایت

لیکن جو پاک ہستیاں زمین کو آسمان کا پیغام سناتی ہیں ان کی اور ہی دنیا ہے۔

دونوں عالم کے سوا تیسرے عالم میں رہے

ان کا "مخدوم بے عنایت" نہیں کام کی اجرت اُنھیں بھی ملتی ہے، مگر کائنات سے نہیں، ان کی نظر آفریدگار کائنات پر ہوتی ہے، اللہ کا پیام سناتے ہیں۔ اللہ ہی کا کام کرتے ہیں۔ اور اسی سے دام لیتے ہیں

(۲)

نوح علیہ السلام کی داستان سنیے سورۂ یونس میں ہے:-

حضرت نوح کی اجرت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ
ان لوگوں کو نوح کی خبر پڑھ سناؤ۔

إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ۔
وہ خبر جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ:۔

يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ، ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً، ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ
اے میری قوم اگر میرا ٹھیرنا اور اللہ کی نشانیوں کو یاد دلاتے رہنا تم پر گراں گزرا تو میں نے اللہ ہی پر بھروسہ کرلیا ہے اب تم بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کے اپنی بات ٹھیرالو، اور اس طرح ٹھیرالو کہ تم سب پر کچھ ڈھکی چھپی نہ رہے، اس کے بعد تمھیں جو کرنا ہے میرے حق میں کرڈالو اور مجھے انتظار میں نہ رکھو۔

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ
اگر تم منہ موڑ بیٹھے تو میں نے تم سے کچھ مزدوری تو مانگی نہ تھی

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ۔
میری مزدوری تو اللہ ہی پر ہے۔

وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔
اور مجھکو حکم ملا ہے کہ میں اہل اسلام ہی کے زمرہ میں رہوں

سورہ شعراء میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ۔
نوح کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ
یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کے بھائی نوح نے کہا تھا

أَلَا تَتَّقُونَ؟ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ، فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ۔
کیا تم لوگ ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار پیغمبر ہوں، اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ۔
میں تم لوگوں سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ۔
میری اجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے۔

(۳)

ہود علیہ السلام کا واقعہ ملاحظہ ہو، اسی سورہ شعراء میں ہے:۔

حضرت ہود کی اجرت

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ ۔ — قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا ۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ ۔ — یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا ۔

أَلَا تَتَّقُونَ ؟ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۔ — کیا تم لوگ ڈرتے نہیں ؟ تمہارے لیے میں ایک امانت دار پیغمبر ہوں، اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

فَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ — میں تم لوگوں سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا ۔

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔ — میری اجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے ۔

سورہ ہود میں بھی یہی قصہ ہے :—

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۔ — قوم عاد کی طرف ہم نے انہیں کے بھائی ہود کو بھیجا تھا

قَالَ : يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ۔ — ہود نے کہا: اے میرے لوگو، اللہ کی عبادت کرو، تمہارا معبود اس کے سوا اور کوئی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نرے باندھنو باندھنے والے ہو،

يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا — اے میرے لوگو اس پر میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔ — میری اجرت تو بس اسی کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ کیا تم لوگ عقل سے بھی کام نہیں لیتے ۔

(۴)

صالح علیہ السلام پر نظر کیجیے :—

حضرت صالح کی اجرت

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ — قوم ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا ۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ — یہ اس وقت کی بات ہے جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا تھا ۔

اَلَا تَتَّقُوْنَ ، اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ۔	کیا تم لوگ ڈرتے نہیں؟ میں تو تمہارے لیے ایک امانتدار پیغمبر ہوں اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ۔	میں تم لوگوں سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔
اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔	میری اجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے۔

(۵)

حضرت لوطؑ کی اجرت | لوط علیہ السلام کا قصہ پڑھیے۔

کَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ نِ الْمُرْسَلِیْنَ۔	قوم لوط نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ	یہ اس وقت کی بات ہے جب ان سے ان کے بھائی لوط نے کہا تھا۔
اَلَا تَتَّقُوْنَ ، اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ۔	کیا تم لوگ ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانتدار پیغمبر ہوں۔ اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ۔	میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔
اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔	میری اجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے۔

(۶)

حضرت شعیبؑ کی اجرت | شعیب علیہ السلام کے مذکور سے عبرت حاصل کیجیے:-

کَذَّبَ اَصْحَابُ الْاَیْکَةِ الْمُرْسَلِیْنَ۔	اصحاب الایکہ (یعنی بن باسیوں) نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ	یہ اس وقت کی بات ہے جب ان سے شعیبؑ نے کہا تھا۔
اَلَا تَتَّقُوْنَ ؟ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ۔	کیا تم ڈرتے نہیں، میں تمہارے لیے ایک امانت دار پیغمبر ہوں، اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ۔ — میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلیٰ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ — میری اجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے۔

یہ تمام تصریحیں قدمائے انبیا (علیہم الصلوٰۃ والسلام) سے تعلق رکھتی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اہل دنیا سے تبلیغ حق کی اجرت کا طالب نہ ہوا۔ اب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو آیات بیّنات ہیں ان میں تفقہ فرمائیے، اور دیکھیے کہ سورۂ یوسفؑ میں تذکرِ واقعات کے بعد آنحضرت صلوٰۃ اللہ علیہ سے کیا خطاب ہوتا ہے۔

(۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انبیاء سابقین کی طرح بندوں سے اجرت کے خواہاں نہیں۔

ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ — یہ غیب کی خبریں ہیں کہ تمہارے پاس ہم نے ان کی وحی بھیجی ہے،

وَمَا کُنْتَ لَدَیْھِمْ اِذْ اَجْمَعُوْآ اَمْرَھُمْ وَھُمْ یَمْکُرُوْنَ۔ — تم تو وہاں حاضر بھی نہ تھے جب وہ اپنے معاملہ میں متفق ہو چکے تھے۔ اور داؤپیچ میں سرگرم تھے۔

وَمَآ اَکْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ — اکثر لوگ خواہ تمہیں کتنی ہی خواہش ہو ایمان لانے والے نہیں

وَمَا تَسْئَلُھُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ — حالانکہ اس پر تم کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے۔

اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ۔ — تمام جہان کے لیے یہ تو صرف یاد دلانے کی چیز ہے۔

سورۂ فرقان میں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا۔ — تمہیں تو ہم نے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے ہی کی حیثیت میں بھیجا ہے۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ — تم ان سے کہدو کہ میں اس پر تم سے کسی طرح کی اجرت نہیں مانگتا

اَنۡ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیۡلًا ۔ بجز اس کے کہ جس کا جی چاہے اپنے پروردگار تک پہنچنے کا راستہ

"وہ کسی طرح کی کوئی اجرت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ جس کا جی چاہے اپنے پروردگار تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرلے"۔ اس سے بھی ایک طرح کی دنیاوی اجرت کا احتمال ممکن تھا، اس لیے دوسری آیۃ میں اس احتمال کا بھی ازالہ کر دیا، سورہ سبا ملاحظہ ہو :-

(۸)

سوال امت ہی کے لیے تھا قُلۡ مَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَکُمۡ ۔ کہو کہ میں نے تم سے جو اجرت مانگی تھی (یعنی یہ کہ جی چاہے تو اللہ کی راہ پر چلو) تو یہ بھی تمہارے ہی لیے ہے (میری ذات کے لیے کوئی اجرت نہیں)۔

اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۚ وَ هُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ۔ میری اجرت تو اللہ ہی پر ہے جو ہر چیز کا شاہد ہے۔

خاتمہ سورہ صٓ میں ہے۔

قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَکَلِّفِیۡنَ ۔ کہو کہ میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا اور نہ میں کلفت اٹھانے والوں میں ہوں۔

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۔ یہ تو تمام جہان کے لیے ایک یاد دلانا ہے۔

وَ لَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعۡدَ حِیۡنٍ ۔ حقیقت میں کچھ وقت کے بعد نہیں اس کی خبر لگ گی

سورۂ انعام میں اگلے پیغمبروں کا تذکرہ کرکے آنحضرت علیہ السلام کو مخاطب فرمایا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقۡتَدِهۡ ۔ یہ وہ لوگ تھے کہ اللہ نے ان کو ہدایت فرمائی تھی اب تم بھی ان کی ہدایت پر چلو۔

قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا ۔ ان لوگوں سے کہو کہ میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِکۡرٰی لِلۡعٰلَمِیۡنَ ۔ یہ تو تمام جہان کو محض یاد دلانے کے لیے ہے۔

سورۂ طور میں حضرت کو تذکیر کا حکم دیا ہے اور پھر استفہام فرمایا ہے کہ دشمنان اسلام کیا آپ کو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ اسی ضمن میں ایک آیت استفہامیہ یہ بھی ہے:۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ کیا تم ان سے کوئی اجرت مانگتے ہو کہ وہ اس بار گراں سے دبے جاتے ہیں

(۹)

انبیا کی شان | مفاد کلام یہ ہے۔

(۱) دعوت حق و تبلیغ اسلام پیغمبروں کا فریضہ ہے، اس فرض کے ادا کرنے کی کوئی اور کسی طرح کی اجرت نہ پیغمبروں نے اہل دنیا سے لی، نہ اس کے طالب ہوئے، نہ یہ ان کے شایان شان تھی، اس دعوت کا اجر اللہ کے ذمہ تھا، اللہ کے بندوں سے اس کا واسطہ نہ تھا۔

(۲) کلام اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ خصوصیت اور بھی روشن کر دی دوسرے پیغمبروں کے حق میں اگر ایک دو آیتیں اتریں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے کہیں زیادہ مخاطب فرمایا گیا اور بار بار اس کی تشریح و توضیح کی گئی۔

کچھ اہل وحی و تنزیل ہی تک یہ شان محدود نہیں اللہ کے دوسرے نیک بندے بھی اللہ کے کام کی اجرت اللہ ہی پر محول رکھتے ہیں، سورۂ یٰسین میں ہے۔

(۱۰)

وَجَاءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اس نے کہا

يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا اے میری قوم رسولوں کی پیروی کرو ان رسولوں کی

يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ پیروی کرو جو تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتے، اور خود وہ ہدایت پر ہیں

سورۂ کہف میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان بزرگ کا قصہ بیان کیا ہے جن کی نسبت:۔ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۔ (ہمارے بندوں میں سے

ایک بندہ جسے اپنے پاس سے ہم نے کچھ رحمت اور اپنے ہی پاس سے کوئی خاص علم دیا تھا، وارد ہے، اس ضمن میں فرمایا۔

(۱۱)

اجرت کا نام آتے ہی جدا ہو گئے

فَانْطَلَقَا حَتّٰی اِذَا اَتَیَا اَھْلَ قَرْیَۃِ نِ اسْتَطْعَمَا اَھْلَھَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْھُمَا، فَوَجَدَا فِیْھَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَہٗ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَیْہِ اَجْرًا، قَالَ ھٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِکَ سَاُنَبِّئُکَ بِتَاْوِیْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَیْہِ صَبْرًا۔

موسی اور وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ جب ایک آبادی والوں کے پاس پہنچے تو وہاں کے لوگوں سے کھانے کو مانگا، انھوں نے ان کو ضیافت دینے سے انکار کیا، وہاں انھیں ایک دیوار ملی جو گرا چاہتی تھی، اللہ کے اس بندے نے اس دیوار کو درست کر دیا، موسی نے کہا:۔ تم چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لیتے، اللہ کے اس بندے نے جواب دیا کہ میں یہ مجھ میں تم میں جدائی ہے۔ البتہ جن تم سے صبر نہ ہو سکا میں ابھی اس کا مطلب بتائے دیتا ہوں۔

(۱۲)

خرج لینے سے انکار

اس کے بعد ذو القرنین کا بیان ہے کہ قوم جب ان سے درخواست کرتی ہے اور اس کی پذیرائی کے لیے ترغیب دلاتی ہے کہ فَھَلْ نَجْعَلُ لَکَ خَرْجًا ؕ (کیا ہم آپ کے لیے کچھ محصول مقرر کر دیں؟) تو وہ اس سے صاف انکار کر دیتے ہیں کہ مَا مَکَّنِّیْ فِیْہِ رَبِّیْ خَیْرٌ (میرے پروردگار نے جس چیز میں مجھے تمکین بخشی ہے وہی میرے لیے بہتر ہے)۔

(۱۳)

ردّ ہدیہ

اجرت درکنار رسا سے جب ہدیہ آتا ہے تو وہ بھی واپس کیا جاتا ہے کہ اَتُمِدُّوْنَنِیْ بِمَالٍ ؟

ؔ الخرج :۔ الاتاوۃ وفسرۃ الفراء بالاجر۔

فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ. کیا تم لوگ مال سے میری مدد
کرنی چاہتے ہو؟ مجھے اللہ نے جو دیا ہے وہ تمہارے دئے سے بہتر ہے، اپنے ہدیہ سے تمہیں کو فرحت ہو رہی ہے۔
انبیاء مرسلین کی شان تو بہت بالا، بہت ہی اعلیٰ ہے" سورۂ دہر میں ابرار اسلام و اتقیاء توحید کی
شان دکھائی ہے۔

(۱۴)

مسلمان کی شان | اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا

حقیقت میں نیک کردار لوگ کافوری مزاج کے پیالے سے پئیں گے، یہ اللہ کے بندے ایک ایسے چشمے سے پیتے ہوں گے جسے جہاں چاہیں گے جاری کر سکیں گے۔

(۱) يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ

(۱) وہ وفائے نذر کریں گے۔

(۲) وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا

(۲) اس دن سے ڈریں گے جس کی چنگاری پھیلی ہوئی ہو گی۔

(۳) وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۔

(۳) کھانے کی محبت رکھتے ہوئے بھی مسکین و یتیم و اسیر کو کھانا کھلائیں گے۔

(۴) اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ

(۴) (کھلائیں گے اور کہیں گے) درحقیقت اللہ ہی کا منہ کر کے ہم تمھیں کھلاتے ہیں۔

(۵) لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا

(۵) نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر۔

(۶) اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا۔

(۶) ہم تو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اس دن کا خوف کرتے ہیں جو بہت ہی خشک اور سخت دن ہوگا۔

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا

اس کردار کی بنا پر اللہ نے ان لوگوں کو اس دن کے شر سے بچا لیا، تازگی و خوشی سے ان کو لا ملایا، اور جیسی

جَنَّةً وَّحَرِيْرًا۔ استقامت کی تھی ویسی ہی جزا بھی دی، رہنے کو بہشت پہننے کو حریر۔

(۱۵)

مودت فی القربیٰ | سورۂ شوریٰ میں نزول فی الکتاب، اقامت میزان، قرب قیامت، حرث دنیا و آخرت، شرک فی الشرع، کلمۃ الفصل، عذاب الیم، عمل صالح، فضل کبیر، و ما یحذو حذوہٗ کیطرف اشارات کرکے ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ یہ وہی ہے جس کی بشارت اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور (خالی ایمان ہی نہیں) نیک کام بھی کیے

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۔ ان سے کہو کہ میں اس پر کوئی اجرت تم سے طلب نہیں کرتا بجز اس کے کہ "قربیٰ" میں مودت رکھو اور جو کوئی نیکی کریگا اس کے لیے ہم اس نیکی میں اور بھی خوبی بڑھا دیں گے

مودت تو ایک طرح کی محبت ہوئی، "قربیٰ" سے یہاں کیا مراد ہے؟

ایک جماعت "قربیٰ" کو خاندانی قرابت پر محمول کرتی ہے اور "مودت فی القربیٰ" سے اہل بیت نبوی کے ساتھ الفت و محبت رکھنے کی تاکید مراد لیتی ہے کہ یہی ان کے نزدیک اجر رسالت ہے۔

(۱۶)

اہل بیت کی مودت لازم ہے | مودت اہل بیت ایک مومن و مسلم کی حیات اسلامی کا لازمہ ہے، شعار ایمان ہے، شان حق ہے، اثر تقوی ہے، جس میں کسی کو کلام نہ ہونا چاہیے مسلمات سے انکار شیوۂ فجار ہے ابرار مومنین و اتقیائے مخلصین کا یہ شیوہ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ جس پیغمبر کے اہل بیت پہ ہر نماز میں درود بھیجیں انھیں اہل بیت کی مودت کے منکر ہوں، اعاذنا من ذالک بفضلہٖ۔

مجال سخن اس میں نہیں محل نظر یہ ہے کہ آیت شریفہ سے کیا نمایاں ہو رہا ہے؟

(۱۷)

طلب اجر ایک طرف تبلیغ دین و دعوت اسلام کی دنیاوی اجرت ممنوع قرار پاتی ہے، اللہ ہی پر اس کا اجر محول کیا جاتا ہے، دوسری جانب اُسی تبلیغ کی یہ اجرت مانگی جاتی ہے کہ میرے اہل بیت سے مودت رکھو۔

فاستثناء المودة من الاجر دليلٌ على انّ النبي صلى الله عليه وسلم طلب الاجر على تبليغه الوحي وذالك غير جائز كما جاء حكاية عنه وعن سائر الانبياء۔

یہ کہنا کہ میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا" اور پھر "مودت فی القربیٰ" کو اس سے مستثنیٰ کر دینا، اس کے تو یہ معنے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ وحی کی اجرت طلب فرمائی، مگر یہ تو جائز نہیں، کلام اللہ میں آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بار بار اس کی تصریح کی گئی ہے اور باقی پیغمبروں کی نسبت بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔

فانّ التبليغ واجب على الرسول لقوله تعالى:- يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ فَإِنْ لَمْ تُبَلِّغْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ، وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔

بات یہ ہے کہ پیغمبر پر تبلیغ تو واجب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے پیغمبر! تجھ پر جو نازل ہوا ہے اس کی تبلیغ کر، اگر تو نے تبلیغ نہ کی تو فرض رسالت ہی ادا نہ کیا، لوگوں سے اللہ تجھے بچائے گا۔

وطلب الاجر على اداء الواجب لا يليق بالمروة بل قد يوجب التهمة ونقصان الحشمة

ایک امر واجب کو ادا کرنا اور پھر اس پر اجرت مانگنا یہ تو شایان مردمی نہیں، اس سے تو بعض اوقات تہمت پیدا ہو سکتا ہے اور حشمت رسالت میں کمی آسکتی ہے۔

(۱۸)

قربیٰ کے معنی اس بحث کو ملتوی کر کے پہلے "قربیٰ" کا مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔

قربیٰ اصل میں قرب سے ماخوذ ہے جو بعد کی جانب مقابل ہے، کلام اللہ میں اس مادہ کا اشتقاق

متعدد معانی پر ہوا ہے۔

(۱) قرب مکانی، مثلاً:- ولا تقربا هذه الشجرة۔

(۲) قرب زمانی مثلاً:- اقترب للناس حسابهم

(۳) حظ وکامیابی مثلاً:- قربات عند الله۔

(۴) رعایت، مثلاً: فانی قریب أجیب دعوة الداع اذا دعان۔

(۵) قدرت، مثلاً:- ونحن اقرب الیه منکم۔

(۶) نسبت، باتفاق مفسرین آیۂ کریمہ میں "قربیٰ" سے یہی مراد ہے۔

ومن هذا المعنى ما اخبر به النبي صلى الله عليه وسلم عن ربه:-

اسی ذیل میں حدیث قدسی ملاحظہ ہو۔

من تقرب الى شبراً تقربت اليه ذراعاً فقرب العبد من الله عز وجل قربه بالذكر والعمل الصالح لاقرب الذات والمكان، وقرب الله من العبد قرب نعمه والطافه وبره واحسانه اليه وترادف منه عنده۔

جو ایک بالشت مجھ سے قریب ہوا میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو گیا اللہ کے ساتھ بندہ کا قرب یہ ہے کہ وہ اللہ کو یاد کرتا رہے اور نیک کام کیا کرے، قرب ذاتی وقرب مکانی مراد نہیں، اللہ کا بندے سے قریب ہونا یہ ہے کہ اللہ کی نعمتیں اس سے قریب ہوں، اللہ اس پر متواتر مہربانی کرتا رہے۔

ومن ذلك ما في الحديث:-

اور دوسری حدیث میں ہے:-

سددوا وقاربوا

سداد اختیار کرو۔ قرب حاصل کرو۔

اي اقصدوا في الامور كلها واتركوا الغلو فيها والتقصير۔

مطلب یہ ہے کہ تمام امور میں اقتصاد و میانہ روی کو اپنا شعار بناؤ، غلو و کوتاہی اور افراط و تفریط کو چھوڑو۔

آیت کی تفسیر ابو جعفر النحاس نے آیۂ کریمہ کی تفسیر نہایت متانت کے ساتھ کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ

فی هذه الآیة اربعة اقوال :-

اس آیت کے چار مطلب بیان کیے گئے ہیں۔

۱- قُل لّا اسئلکم علیه اجراً. قل لا اسئلکم علی الایمان جُعلاً الا ان تودونی لقرابتی وتصدقونی وتمنعوا منی.

(۱) "کہو کہ میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا" یعنی کہو کہ ایمان لانے کا کوئی محصول تم سے نہیں مانگتا، بجز اس کے کہ بربنائے قرابت مجھ سے مودت رکھو، میری تصدیق کرو، اور میری حفاظت کرتے رہو۔

ففعل ذالک الانصار رحمهم الله، ومنعوا منه عن انفسهم واولادهم.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار نے یہی کیا، جیسی اپنی جان اور اولاد کی حفاظت کرتے تھے ویسی ہی آپ کی حفاظت کی۔

ثم نسختها: قل ما سألتکم من اجرٍ فهو لکم، ان اجری الا علی الله.

بعد کو یہ آیت اتری "کہو کہ میں نے تم سے جو اجرت مانگی تھی وہ تمہارے ہی لیے تھی، میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے"۔ اس آیت نے آیت مودت فی القربیٰ کو منسوخ کر دیا۔

۲- ومذهب عکرمة انها لیست بمنسوخة، قال: کانوا یصلون ارحامهم فلما بعث النبی صلی الله علیه وسلم قطعوه، فقال لا اسئلکم علیه اجراً علی ان تودونی وتحفظونی لقرابتی ولا تکذبونی.

(۲) عکرمہ کا مذہب یہ ہے کہ آیت مودۃ فی القربیٰ منسوخ نہیں، ان کا بیان ہے کہ عرب صلہ رحم کے خوگر تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو قطع رحم کر بیٹھے، اس حالت میں آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ مجھ سے "مودت رکھو" قرابت کی بنا پر میری حفاظت کرتے رہو، اور میری تکذیب نہ کرو۔

(۳) وفی روایة قیس ..... قال لما انزل الله تعالیٰ

(۳) قیس کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب

یہ آیت نازل فرمائی کہ۔

قل لا اسألكم عليه اجرا الا المودة فى القربىٰ قالوا يا رسول الله من هؤلاء الذين نودهم قال: علی و فاطمة و ولديهما

کہو میں تم سے اس پر کوئی اجرت، بجز مودت فی القربیٰ کے، نہیں مانگتا" تو لوگوں نے گذارش کی: یارسول اللہ یہ کون لوگ ہیں جن سے ہم مودت رکھیں، فرمایا: علی و فاطمہ اور ان کے دونوں لڑکے۔

۴- والقول الرابع من اجمعها وابينها عن الحسن: قل لا اسألكم عليه اجرا الا المودة فى القربىٰ، قال: التقرب الى الله والتودد اليه بطاعته

(۴) چوتھی تفسیر سب سے جامع اور سب سے واضح ہے حسن بصری سے روایت ہے کہ آیۂ کریمہ: کہو کہ بجز مودت فی القربیٰ کے میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا" اس میں "قربیٰ" سے تقرب الی اللہ مراد ہے، یعنی اللہ کے نزدیک ہو جاؤ اور اس کی عبادت کے ذریعہ اس کے ساتھ مودت بڑھاؤ۔

(۲)

مذہب راجح | وھذا قول حسن

یہ بڑی اچھی تفسیر ہے

ويدل على صحته الحديث المسند عن رسول الله صلى الله عليه وسلم.... قال قل لا اسألكم على ما انبئكم به من البيان والهدىٰ اجرا الا ان تودوا الله وتتقربوا اليه بطاعته

اس کے صحیح ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جو بسند صحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، "کہو کہ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا یعنی جو نبوت وہدایت پیش کرتا ہوں اور جو کچھ بیان کرتا ہوں اس کے لیے کسی بدلہ کا طالب نہیں، بجز اس کے کہ اللہ سے مودت رکھو اور اس کی عبادت کرکے اس کے ساتھ تقرب حاصل کرو۔

فهذا المبين عن الله قد قال هذا، وكذا

اللہ کی وحی کے اس بیان کرنے والے نے حقیقت میں

علیهم السلام قبل ان اجری الا علی الله ۔ ؎۱

ہی فرمایا ہے۔ اسی طرح انبیاء سابقین بھی کہہ چکے کہ میرا اجر وعوض اللہ ہی کے ذمہ ہے۔

(۲۱)

شواہد ابن جریر نے پہلی تفسیر اختیار کی ہے، لیکن اس آخری تفسیر کی تائید میں بھی متعدد حدیثیں روایت کی ہیں۔ ؎۲

عن المجاہد عن ابن عباس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال لا اسألکم علی ما اتیتکم به من البینات والهدی اجرا الا ان تودّدوا الله وتتقربوا الیه بطاعته

مجاہد نے ابن عباس کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کی کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر کہو کہ میں جو آیات بینات و ہدایات یعنی اسلام و قرآن تمہارے پاس لایا ہوں ان کا بدلہ بجز اس کے اور کچھ نہیں چاہتا کہ اللہ کے دوست بنو اور اس کی عبادت کرکے اس سے تقرب پیدا کرو۔

عن الحسن انه قال فی هذه الآیة قل لا اسألکم علیه اجرا الا المودة فی القربیٰ قال القربیٰ الی الله۔

حسن بصری سے روایت ہے کہ آیت "کہو کہ میں تم سے بجز مودت فی القربیٰ کے اس باب میں اور کوئی بدلہ نہیں چاہتا" کی تفسیر یہ ہے کہ قربیٰ سے مراد اللہ کا تقرب ہے۔

اخبرنا عوف عن الحسن فی قوله قل لا اسألکم علیه اجرا الا المودة فی القربیٰ قال الا التقرب الی الله والتودد الیه بالعمل الصالح

عوف نے حسن سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کی کہ کہو میں تم سے اس پر بجز مودت فی القربیٰ کے اور کوئی اجرت نہیں چاہتا، اس میں قربیٰ سے اللہ کا تقرب اور بذریعہ عمل صالح اس کے ساتھ مودت مراد ہے۔

؎۱ کتاب الناسخ والمنسوخ طبع مصر ۱۳۲۲ھ ص ۲۱۶/۲۱۷

؎۲ تفسیر ابن جریر طبع مصر ۱۳۲۹ھ ج ۲۵، ص ۱۵

حدثنا سعید عن قتادۃ، قال قال الحسن فی قولہ قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ قال لا اسئلکم علی ما جئتکم بہ وعلی ھذا الکتاب اجراً الا المودۃ فی القربیٰ الا ان تودد والی اللہ بما یقربکم الیہ و عمل بطاعتہ

سعید نے قتادہ کے ذریعہ سے حسن کی یہ حدیث روایت کی کہ "کہو میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، البتہ مودۃ فی القربیٰ کا خواستگار ہوں" اس آیہ کا مطلب یہ ہے کہ میں جو شریعت تمہارے پاس لایا ہوں اور یہ جو قرآن تمہارے لیے اترا ہے میں بجز اس کے اور کوئی اجرت اس کی نہیں مانگتا کہ عمل سے عبادت سے اور ان چیزوں سے جو خدا سے تم کو قریب کرنے والی ہوں اللہ کے ساتھ مودۃ پیدا کرو اور اس کی محبت کے آرزومند بنو۔

عن معمر عن قتادۃ فی قولہ تعالیٰ قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ الا ان تودد والی اللہ فیما یقربکم الیہ۔

معمر سے قتادہ نے آیت شریفہ "میں اس پر تم سے بجز مودۃ فی القربیٰ کے اور کوئی اجرت نہیں مانگتا" کی تشریح کی کہ میں بجز اس کے اور کسی بات کا خواہاں نہیں ہوں کہ جو باتیں اللہ سے تم کو قریب کرنے والی ہیں ان کے ذریعہ تم اللہ کے دوست بنو۔

حقوق الزوجین

(۴)

قضاء شرعی طلاق اور خلع کی بحث میں قانون اسلامی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ قانون اس قاعدۂ کلیہ پر وضع کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق اگر قائم رہے تو حدود اللہ کی حفاظت اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہے جس کو قرآن میں امساک بالمعروف کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اگر اس طرح ان کا باہم مل کر رہنا ممکن نہ ہو تو تسریح باحسان ہونا چاہیے یعنی جو میاں بیوی بھلی طرح مل کر نہ رہ سکتے ہوں وہ سیدھی طرح الگ ہوجائیں اور ایسی صورتیں پیدا نہ ہونے پائیں کہ ان کے اختلاف سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی تلخ ہو بلکہ خاندانوں میں فتنے برپا ہوں، سوسائٹی میں گندگی پھیلے، اخلاقی مفاسد کی اشاعت ہو اور آیندہ نسلوں تک ان کے برے اثرات متعدی ہوجائیں۔ انہی خرابیوں کا سد باب کرنے کے لیے شریعت نے مرد کو طلاق کا اور عورت کو خلع کا حق دیا ہے تاکہ اگر وہ چاہیں تو خود تسریح باحسان کے اصول پر عمل کرسکیں لیکن بہت سی ایسی جھگڑالو طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جو نہ امساک بالمعروف پر عمل کرسکتی ہیں اور نہ تسریح باحسان پر آمادہ ہوتی ہیں نیز ازدواجی معاشرت میں ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں جن میں زوجین کے درمیان یا تو حقوق کے باب میں اختلاف واقع ہوتا ہے یا امساک بالمعروف اور تسریح باحسان دونوں پر عمل کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے شریعت نے طلاق اور خلع کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی حقوق کے تصفیہ اور حدود کی حفاظت کے لیے مقرر کر دیا ہے جس کا نام قضاء شرعی ہے۔

قبل اس کے کہ ان مسائل کو بیان کیا جائے جو قضاء شرعی سے تعلق رکھتے ہیں چند اصولی مباحث کی توضیح ضروری ہے۔

قضا کے لیے اولین شرط قضاء شرعی کی جو شرائط تفصیل کے ساتھ کتب فقہ میں مذکور ہیں، ان میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ قاضی لازماً مسلمان ہونا چاہیے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جس کو فقہا نے بتصریح بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اصول شرع کے تحت شرعی مسائل میں مسلمانوں پر غیر مسلم حاکم کا حکم خواہ ظاہراً نافذ ہو جائے مگر باطناً نافذ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر ایک غیر مسلم حاکم ایک مسلمان کا نکاح فسخ کرے تو خواہ اس کا یہ حکم احکام شرع کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، اور زوجین میں عملاً تفریق ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن درحقیقت نہ اس کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہوگا اور نہ شرعاً عورت کے لیے دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ اگر وہ نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہوگا اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں اس کی اولاد ناجائز ہوگی۔ ممکن ہے کہ اس وجہ کو آج کل کی ذہنیتیں محض وہمی (Sentimental) قرار دے کر رد کر دیں لیکن اگر مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ ان کے شخصی معاملات خود انہی کے شخصی قانون (Personal law) کے مطابق طے کیے جائیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے شخصی قانون کے قواعد میں سے ایک اہم قاعدہ کو غیر اسلامی قانون کے نظریات کی بنا پر ساقط کر دیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جن مسائل کا تصفیہ قاضی کے فیصلہ پر چھوڑا گیا ہے ان کے لیے اگرچہ شریعت میں مفصل قوانین موجود ہیں لیکن شخصی معاملات میں ہر مقدمہ کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر ان قوانین کی صحیح تعبیر و تنفیذ اور اصول قانون سے حسب موقع جزئیات کا استنباط، اور روح قانون کے مطابق فصل خصومات کے جملہ شرائط کا لحاظ، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ قاضی میں قوت اجتہاد اور اس کے ساتھ اعتقاداً اس قانون کا احترام بھی موجود ہو جس کو نافذ کرنے کے لیے وہ منصب قضاء پر مامور ہوا ہے، اور یہ دونوں باتیں اسی شخص میں متحقق ہو سکتی ہیں جو مذہباً مسلمان ہو، اسلامی قانون کے اصول و فروع پر حاوی ہو، اس کی سپرٹ کو اچھی طرح سمجھتا ہو، اس کے اصل مآخذ پر دسترس رکھتا ہو، اور مسلم سوسائٹی کے نظام ترکیبی سے اندرونی طور پر بھی واقف ہو۔ ایک غیر مسلم جج میں ان صفات کا پایا جانا کسی طرح ممکن نہیں اور اس وجہ سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ مسلمانوں کے شرعی قضایا کا صحیح فیصلہ کر سکے گا۔

ہندوستان میں قضاءِ شرعی نہ ہونے کے نقصانات

ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۴ء تک مسلمانوں کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے جن کا انتخاب علماء کے گروہ میں سے کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد منصب قضاء منسوخ کر دیا گیا، اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزی عدالتوں کے حدود اختیار میں داخل کر دیے گئے۔ اس کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اصول شریعت کے مطابق جس چیز پر "قضائے شرعی" کا اطلاق ہوتا ہے وہ قریب قریب بالکلیہ مفقود ہوگئی، اور مسلمانوں کے لیے اپنے شرعی معاملات میں ان عدالتوں سے ایسا فیصلہ حاصل کرنا غیر ممکن ہوگیا جو ان کے مذہب کی رو سے جائز شرعی فیصلہ کہا جا سکتا ہو۔ دوسرا نقصان (جو اہمیت میں پہلے نقصان سے کسی طرح کم نہیں) یہ ہے کہ ان عدالتوں کے پاس نہ وہ ذرائع ہیں جن سے وہ قانون اسلامی کے اصول و فروع پر اتنی وسیع نظر بہم پہنچا سکتے ہوں کہ ان میں صحیح قوت اجتہاد پیدا ہو جائے، اور نہ ان کے دل میں اس قانون کا اتنا احترام موجود ہوتا ہے کہ اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو تامل ہو۔ ان کے علم کا مدار جن کتابوں پر ہے وہ ایسے مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جو عربی سے ناواقف تھے قانون کے اصلی ماخذ سے بے بہرہ تھے اور اصطلاحات قانون تک کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے، مثلاً ہیملٹن (Hamilton) جس نے ایک فارسی شرح کی مدد سے ہدایہ کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ وہ غریب ہدایہ کو سمجھنے کی قابلیت ہی نہ رکھتا تھا، اور فقہ کی معمولی اصطلاحات میں بھی اس نے اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ اکثر مقامات پر اصل ہدایہ کی طرف رجوع کیے بغیر اس کی عبارت سمجھ میں نہیں آسکتی اور بیلی (Baillie) جس کا (Digest of Mohammadan Law) فتاویٰ عالمگیری کے اقتباسات کے ترجمہ سے ماخوذ ہے۔ اور میکناٹن (Macnaghton) جس کی کتاب (Principles of Mohammadan Law)، ناقص معلومات اور اس پر ناقص فہم و تعبیر کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ انگریزی عدالتیں خود اپنے دائرہ

معلومات کی اس تنگی کا اعتراف کرتی ہیں، چنانچہ جسٹس مارکبی[1] ایک مقدمہ کے فیصلہ میں لکھتا ہے:-

"شرع اسلام کو معلوم کرنے کے جو ذرائع عدالت کو حاصل ہیں وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں ..... کہ میں اس سے تعلق رکھنے والے مسائل کے تصفیہ سے بچنے کے ہر طریقہ کو اختیار کرنے پر بخوشی آمادہ ہوں"۔

مگر ایسی محدود معلومات کے ساتھ یہ عدالتیں اسلامی قانون میں اجتہاد کرنے کی جرأت کرتی ہیں اور اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا کیونکہ نہ اس قانون کا احترام ان کے عقائد میں داخل ہے، اور نہ حکومت مسلطہ کے نظام عدلیہ کی طرف سے ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قانون کے حدود سے تجاوز نہ کر سکیں۔ ایک مقدمہ[2] کے فیصلہ میں چیف جسٹس گارتھ نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ ان عدالتوں کی صحیح پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہیں۔

"قانون اسلام جس کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے اور جو قدیم کتابوں میں مندرج ہے اب سے صدیوں پہلے بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک میں جاری ہوا تھا جن کے قانونی اور تمدنی حالات ہندوستان کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اگرچہ ہم ایسے مقدمات میں جو مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں حتی الامکان احکام شرع اسلامی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اول تو یہی معلوم کرنا مشکل ہے کہ دراصل وہ احکام کیا تھے، پھر ان اختلافات میں توفیق دینا بھی مشکل ہے جو اکابر مجتہدین یعنی امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے درمیان بکثرت پیش آئے ہیں۔ اس لیے امکانی حد تک ہمیں اس صحیح اصول کو دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس پر کوئی حکم مبنی ہو، اور پھر قواعد انصاف، نیک نیتی اور دوسرے ملکی قوانین اور تمدنی حالات کو پیش نظر رکھ کر اسے نافذ کرنا چاہیے"۔

[1] خواجہ حسین بنام شہزادی ہزاری بیگم۔ [2] ملک عبدالغفور بنام ملکا۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک حاکم عدالت جو اسلامی قوانین سے اپنی ناواقفیت کا معترف ہے اور اختلافات ائمہ میں توفیق دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، وہ اسلامی قوانین پر اس ناقص علم کے ساتھ اجتہاد سے کام لینے کو علانیہ جائز ٹھیراتا ہے اور اسے ایک عدالتی فیصلہ میں یہ بات ظاہر کرتے ہوئے کوئی تامل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں پر اسلامی قانون کو نافذ کرنے میں صرف اسلامی قانون ہی کے حدود کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسرے قوانین ملکی اور تمدنی حالات اور قواعد انصاف کے متعلق خود اپنے نظریات کا لحاظ کرنا بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ یہ اسی اجتہاد بلا علم و تقویٰ کا نتیجہ ہے کہ جو ادھورا اور ناقص قانون محمڈن لا کے نام سے ہمارے ملک کی عدالتوں میں متداول ہے اس کا بھی ٹھیک ٹھیک نفاذ ہمارے شرعی معاملات میں نہیں ہوتا اور عدالتی فیصلوں سے اس کی صورت روز بروز مسخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اصلاح کی راہ میں پہلا قدم: اس معاملات نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق اسلامی قوانین کی توضیحات کرنے اور قانونی وسائل سے ان کو عدالتوں میں رائج کرنے سے پہلے حکومت سے یہ اصول تسلیم کرالینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے شرعی مقدمات کا تصفیہ مسلمان حاکم کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اگر حکومت مسلمانوں کے لیے قضائے شرعی کے اس پرانے طریقے کو پھر سے زندہ کر دے جو ۱۷۷۲ء سے ۱۸۶۴ء تک برٹش انڈیا میں قائم تھا، اور جس پر اب بھی فلپائن، جاوا، تونس، الجزائر، شام، فلسطین، یوگوسلاویا، پولینڈ، اور دوسرے اسلامی ممالک میں غیر مسلم حکومتیں عامل ہیں، تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں، لیکن اگر حکومت کو اس میں تامل ہو تو مسلمانوں کی شرعی مشکلات کو دور کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ مذہب مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچایت مقرر کی جائے جس کے ارکان پر عموماً اس ضلع کے مسلمانوں کو اعتماد ہو اور جن میں سے کم از کم ایک رکن مستند عالم دین ہو۔ پھر ایک مخصوص قانون کے ذریعہ سے اس پنچایتی نظام کو تسلیم کرایا جائے جس میں اس امر کی تصریح ہو کہ مسلمانوں کے معاملات نکاح و طلاق وغیرہ میں پنچایت کے فیصلوں کی حیثیت عدالتی فیصلوں کی سی ہوگی اور انگریزی عدالتوں میں اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی

اور خود انگریزی عدالتوں نے بھی جو مقدمات نکاح و طلاق وغیرہ فیصل کیے ہیں ان کو بھی پنچایتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔[1]

برٹش انڈیا کے علاوہ غیر مسلم ریاستوں، اور ان اسلامی ریاستوں میں بھی جنہوں نے انگریزی حکومت کی تقلید میں قضائے شرعی کو موقوف کر کے شرعی معاملات کو عام دیوانی عدالتوں کے دائرۂ سماعت میں داخل کر دیا ہے، اصلاح معاملات کے لیے سب سے پہلے یہی کوشش ہونی چاہیے کہ یا تو قضائے شرعی کا بندوبست کیا جائے، یا پھر پنچایتی سسٹم قائم کر کے اس کو از روئے قانون تسلیم کرایا جائے جب تک یہ نہ ہوگا مجالس وضع قوانین میں کسی مسودۂ قانون کو پیش اور پاس کرا لینا اسلامی اغراض کے لیے ہرگز سود مند نہ ہوگا۔

ایک جدید مجموعہ قوانین کی ضرورت انتظام قضاء شرعی کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے، اور وہ ایک ایسے کتابچہ کی تدوین ہے جس میں مسلمانوں کے شرعی معاملات کے متعلق فقہی احکام کو دفعات کی شکل میں تشریحات سمیت مرتب کر دیا جائے، تاکہ عدالتوں یا پنچایتوں میں موجودہ انگریزی محمڈن لا کی جگہ اس کو رواج دیا جا سکے۔ مصر میں جب (Mixed Tribunals) قائم کیے گئے تھے تو وہاں بھی ایسے ایک مجموعہ قوانین (Code) کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جس میں نہایت مستند مآخذ سے تمام ضروری قوانین یکجا مرتب کر دیے گئے ہوں، چنانچہ حکومت مصر کے ایماء سے قدری پاشا کی صدارت میں علماء ازہر کی مجلس نے اس کام کو انجام دیا، اور اس مجلس کے مرتب کیے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے عدالتوں میں رائج کیا گیا[2] ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جس میں ہر گروہ کے

---

[1] حنفیہ کے نزدیک پنچایت کا فیصلہ قضاء قاضی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا لیکن اگر حکومت وقت کی طرف سے ان پنچایتوں کے اختیار سماعت کو تسلیم کر لیا جائے اور انھیں اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے ضروری اختیارات مل جائیں تو مذہب حنفی کے مطابق بھی ان کے فیصلے قضاء شرعی کے حکم میں ہوں گے۔

[2] اس مجموعہ کا ترجمہ فرنچ زبان میں Droit Mussulman کے نام سے شائع ہوا ہے اور مصر کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک کی عدالتوں میں بھی اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

چند علماء چند ماہرین قانون کے ساتھ مل کر ایک مفصل ضابطہ، ضروری تشریحات کے ساتھ مرتب کریں، اس ضابطہ کو ابتداءً ایک مسودہ کی شکل میں شائع کرکے مختلف جماعتوں کے علماء کی رائے دریافت کی جائے پھر ان آرا اور تنقیدات کا مناسب لحاظ کرکے اس پر نظر ثانی کیجائے اور جب ضابطہ اپنی آخری صورت میں مرتب ہو جائے تو مجالس قانون ساز میں ایک ایکٹ کے ذریعہ سے یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے شرعی معاملات کے لئے اسی مجموعہ کو محمڈن لا کی مستند کتاب قرار دیا جائے گا اور اس کے خلاف کسی عدالت کے سابق نظائر یا محمڈن لا کی کسی کتاب کے بیانات قابل اعتبار نہ ہوں گے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب ہماری کتب فقہ میں تمام مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں تو ایک نیا مجموعہ مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اعتراض صرف ممکن ہی نہیں بلکہ ایک گروہ کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ اس تجویز کی ضرور مخالفت کی جائے گی، اس لیے ہم اختصار کے ساتھ وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ کام ضروری ہے۔

یہ بات تو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل منتشر ہیں، قدیم طرز بیان و انداز ترتیب پر لکھے ہوئے ہیں، اور ایسی زبان میں ہیں جس سے اس ملک کے قانون پیشہ اصحاب اور حکام عدالت عموماً واقف نہیں ہیں۔ آج کل کے لوگوں کو نہ اتنی فرصت کہ کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے مبسوطات کی طرف مراجعت کرسکیں، نہ اتنی استعداد کہ ان کو سمجھ سکیں۔ ایسی حالت میں جب کوئی پیچیدہ مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوتا ہے تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ علماء سے فتویٰ لیں۔ فتویٰ کی صحت کا مدار اس پر ہے کہ مفتی کے سامنے مقدمہ کی پوری روداد ہو اور وہ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر شرعی حکم بیان کرے۔ لیکن بہت کم معاملات میں اس طرح فتوے حاصل کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ہر فریق کے وکلاء صورت مقدمہ کو اپنی اغراض کے مطابق ڈھال کر مفتی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور مفید مطلب فتویٰ حاصل کرکے عدالتوں کے سامنے لے جاتے ہیں، جن سے درحقیقت اغراض انصاف کے لیے کوئی رہنمائی نہیں ہو سکتی

ان خرابیوں کا علاج ایک مستند مجموعہ قوانین کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔

لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہی کتابوں میں جتنے احکام بیان کیے گئے ہیں ان میں زیادہ تر عام انسانی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان احکام کو لفظ بلفظ لے کر ہر جگہ ہر معاملہ پر بے تکلف جاری کر دینا اصلاً غلط ہے۔ ان کی صحیح تنفید موقوف ہے اس پر کہ:

اولاً جس اسلامی جماعت میں ان کو نافذ کیا جا رہا ہے اس کی اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالت کو پیش نظر رکھا جائے، یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کے اجتماعی عادات و خصائل اور رسم و رواج کس قسم کے ہیں وہ کس ماحول میں رہتے ہیں! اس ماحول کے ان پر کیا اثرات ہیں ان کی سیرت اور ان کے معاملات میں اسلام کا اثر کس قدر قوی یا ضعیف ہے، بیرونی اثرات سے ان کے اسلامی خصائص میں کس قدر فرق واقع ہوا ہے اور عام تمدنی حالات سے معاملات کی فقہی حیثیت میں کیا تغیرات رونما ہوئے ہیں۔

ثانیاً ہر مقدمہ کے مخصوص انفرادی حالات پر نظر رکھی جائے، فریقین کی سیرت، عمر، تعلیم، جسمانی حالات، معاشی و تمدنی حیثیت، گذشتہ تاریخ، خاندانی روایات اور ان کے طبقہ کی عام حالت سب پر نگاہ ڈال کر رائے قائم کی جائے کہ ایک خاص جزئی معاملہ میں ان پر قانون کا نفاذ کس طریقہ سے کیا جائے جس سے قانون کا مقصد بھی ٹھیک ٹھیک پورا ہو جائے، اور اصول قانون سے انحراف بھی نہ ہونے پائے۔

ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص فقہ کی کسی پرانی کتاب میں سے ایک جزئیہ نکالے اور آنکھیں بند کر کے اس کو ہر اس مقدمہ میں جو اس جزئیہ سے تعلق رکھتا ہو چسپاں کرتا چلا جائے تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہوگی جو بقراط اور جالینوس کے نسخے لے کر بیٹھ جائے، اور ملک کی آب و ہوا، موسم، مریضوں کے مزاج، اور امراض کی جداگانہ کیفیتوں سے آنکھیں بند کر کے ان نسخوں کو برتنا شروع کر دے۔ حکمائے قدیم کے مرتب کیے ہوئے نسخے اپنی جگہ نہایت صحیح اور حکیمانہ سہی، مگر وہ

اس لیے کب مرتب کیے گئے تھے کہ جاہل عطار ان کو برتیں؟ انہیں استعمال کرنے کے لیے بھی علم، تجربہ، حکمت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح ائمۂ مجتہدین نے شریعت کے قواعد اور اساسی احکام سے جو جزئی مسائل مستنبط کئے ہیں وہ اپنی جگہ نہایت درست سہی لیکن یہ بات تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگی کہ ان اجتہادی احکام کو تفقہ اور تدبر کے بغیر اس طرح استعمال کیا جائے گا جیسے ڈاک خانہ کی مہر کو ایک جاہل چپراسی ہر لفافہ پر لگاتا چلا جاتا ہے۔

قانون اسلام ایسے حکیمانہ اصول پر بنایا گیا تھا کہ اس کے ماتحت کسی فرد یا عورت کا مجبوراً ابدی اخلاقی (۱) میں مبتلا ہونا، یا سوسائٹی میں موجب فتنہ وفساد بن جانا قریب قریب محال تھا، اور یہ تو بالکل ہی ناممکن تھا کہ اس قانون کی کسی سختی سے مجبور ہو کر کوئی مسلمان عورت یا مرد دائرۂ اسلام سے نکل جائے لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف بے شمار خانگی جھگڑے بلکہ سخت اخلاقی مفاسد حتی کہ ارتداد تک کے واقعات محض اس وجہ سے رونما ہو رہے ہیں کہ اکثر معاملات میں قانون اسلام کے تحت لوگوں کے لیے صحیح اور عادلانہ فیصلہ حاصل کرنا محال ہو گیا ہے۔ تفقہ اور تدبر نہ مفتیوں میں ہے نہ حکام عدالت میں۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں دیکھتا کہ ہم ایک عام حکم کو جس ملک جس سوسائٹی اور جس خاص مقدمہ میں نافذ کر رہے ہیں اس کی کون کونسی خصوصیات کو ملحوظ رکھکر اس حکم کے عموم میں اصول شریعت کے ماتحت تخصیص کرنے کی ضرورت ہے تاکہ شریعت کے مقاصد میں سے کوئی مقصد فوت نہ ہونے پائے اور اصول میں کسی اصل کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔ جہاں تک حکام عدالت کا تعلق ہے ان کی معذوری تو ظاہر ہے، رہے علما، تو ان میں سے بعض تو اس سے زیادہ کی استعداد ہی نہیں رکھتے کہ قدیم کتب فقہ میں جو جزئیات جس عبارت کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک اسی عبارت کے ساتھ نکال کر پیش کر دیا کریں۔ اور بعض کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے وسعت نظر اور تفقہ فی الدین سے سرفراز کیا ہے، لیکن فرداً فرداً ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ کسی مسئلہ میں تفقہ سے کام لے کر کسی قدیم

جزئیہ کی عبارت سے یک سر مو بھی انحراف کر جائیں، کیونکہ ایک طرف خود انھیں اپنے مبتلائے غلط ہونے کا خوف اس جرات سے باز رکھتا ہے اور دوسری طرف یہ خوف دامنگیر ہوتا ہے کہ دوسرے علماء کی طرف سے ان پر غیر مقلدیت کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہر صوبے کے جلیل القدر اور با اثر علماء کی ایک جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اجتماعی قوت و اثر سے کام لے کر شرعی معاملات کے لیے ایسا ضابطہ بنائے جو مسلمانانِ ہند کی موجودہ اخلاقی تمدنی اور معاشی حالت سے مناسبت رکھتا ہو اور جس میں اتنی لچک بھی ہو کہ مخصوص انفرادی حالات میں اصول کے تحت جزئی احکام کے اندر مناسب تغیر کیا جا سکے۔

اگر کوئی شخص اس طریقہ کو "غیر مقلدیت" قرار دیتا ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے، وہ نہیں سمجھتا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید اور انبیاء کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ وہ نہیں جانتا کہ جاہل کی تقلید اور عالم محقق کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ اسے اتنا وقوف بھی نہیں کہ کسی مذہب فقہی کا اتباع کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اس نے تقلید کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ اپنے مذہب فقہی کو بمنزلۂ دین، اور اس مذہب کے امام کو بمنزلۂ نبی، اور اس کے مسائل کو نصوص کتاب اللہ کی طرح اٹل سمجھا جائے، اور یہ بات عقیدہ کے طور پر دل میں بٹھالی جائے کہ اس مذہب کے کسی مسئلہ میں اصلاح ترمیم اور اضافہ تو درکنار اس پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈالنا بھی گناہ عظیم ہے، اور کسی مسئلہ میں اس مذہب کے کسی جزئیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب فقہی سے کوئی جزئیہ اخذ کرنا زمانۂ اجتہاد یعنی چوتھی صدی ہجری تک تو حلال تھا مگر اس کے بعد حرام ہو گیا لیکن اس طرح کی تقلید علماء سلف میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں، اور نہ اس کے لیے کوئی شرعی ثبوت کہیں سے مل سکتا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ کے تلامذہ نے سینکڑوں مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کیا اور اس کے باوجود وہ حنفیت سے خارج نہ ہوئے علماء احناف نے امام اعظم اور ان کے تلامذہ کے اختلافات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو ترک کر کے بعض کو مفتیٰ بہ قرار دیا مگر اس تحقیق و تنقید کے باوجود کوئی ان کو

غیر مقلد نہیں کہہ سکتا۔ چوتھی صدی ہجری سے لیکر آٹھویں اور نویں صدی تک کے علمائے احناف متقدمین کے اجتہادی مسائل میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کرتے رہے اور جب ضرورت دوسرے ائمۂ مجتہدین کے دوسرے مذاہب سے مسائل اخذ کرکے ان کے مطابق فتوے دیتے رہے مگر کسی نے اس اجتہاد پر غیر مقلدیت کا حکم نہیں لگایا کسی میں یہ جرأت نہیں کہ ابواللیث سمرقندی شمس الائمہ سرخسی، صاحب ہدایہ، قاضی خان، صاحب کنز، علامہ شامی اور ایسے ہی دوسرے علمار کو محض اس بنار پر غیر مقلد کہدے کہ انھوں نے مذہب حنفی کے مسائل میں اپنے زمانے کے حالات وضروریات کے لحاظ سے لچک پیدا کی اور جن معاملات میں اس مذہب کے بعض احکام کو موجب ضرر یا عام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابل عمل پایا ان میں دوسرے مذاہب فقیہہ کے مطابق فتوی دیا، اور اس بات کو مذہب حنفی کے اصول میں داخل کرلیا کہ بوقت ضرورت مذہب غیر پر حکم اور فتوی دینا جائز ہے بشرطیکہ اس میں اتباع ہوا نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اگر لوگ بطور خود اپنی ضرورتوں کے مواقع پر دوسرے مذاہب کے مطابق عمل کرنے یا خود اپنے مذہب کی رخصتوں سے فائدہ اٹھانے میں آزادی برتیں تو اندیشہ ہے کہ اس سے اتباع ہوا اور تلفیق خارق اجماع اور تتبع رخص مذاہب اور تلاعب بالدین کا دروازہ کھل جائے گا اور معاملات میں سخت ابتری پیدا ہو گی لیکن اگر علمائے دین تقویٰ اور نیک نیتی کے ساتھ باہم مشورہ کرکے مسلمانوں کی ضروریات اور حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا کریں، تو اس میں کسی دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ اگر کسی مسئلہ میں نادانستہ ان سے غلطی بھی ہو تو نصوص صریحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حق تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا اور ان کی نیک نیتی کا ان کو اجر دے گا۔ اس راستہ کو اختیار کرنے میں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی خطرہ ہے کہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گی اور ان کے متبعین میں سے بھی ایک گروہ ان سے بدظن ہو جائے گا لیکن اس سے بڑا خطرہ اس راستہ کے

اختیار نہ کرنے میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی ضرورتوں سے تنگ آکر قانون اسلامی کے بجائے ہوائے نفس کا اتباع کریں گے اور ان میں تلاعب بالدین اور حدود اللہ کی خلاف ورزی اور دین و اخلاق کی خرابی، اور کفر و معصیت کی وبائیں پھیلینگی اور عیسائی قوموں کی طرح وہ بھی اپنے مذہب کے قانون کو چھوڑ کر انسانی قوانین کو اختیار کریں گے، تو قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اسی لیے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسی لیے تھی کہ تم اس کو لیے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو یُسر بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے عُسر بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لیے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔ البتہ جہلا کو یہ جوابدہی کرنے کا موقع ضرور مل جائے گا کہ رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا۔

یہ ضمنی بحثیں چونکہ ضروری اور اہم تھیں اور ان کا تفصیلی بیان ناگزیر تھا اس لیے ان کو اتنی جگہ دینی پڑی اس کے بعد ہم اپنے اصل بحث کی طرف رجوع کریں گے۔

(باقی)۔

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

مصنفہ استاذ امام مولنا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ترجمہ جناب مولنا امین احسن صاحب اصلاحی

(۳)

نماز اور قربانی میں باہمی مناسبت ۱۰۔ نماز اور قربانی میں بہت سے پہلو ہیں قرآن نے ان سب کی طرف اشارے کیے ہیں لیکن یہاں ان سب کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتاب المفردات میں پوری تفصیل ملے گی۔ اس جگہ ہم ان دونوں کے صرف ان پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے جن سے ان کی باہمی مناسبت واضح ہو۔

ہر چند قرآن نے ان کو تصریح کے ساتھ نہیں بیان کیا ہے لیکن جو شخص قرآن کی آیات اور ان کے کلمات کے باہمی نظم پر غور کرے گا وہ کسی طرح ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ غور کے لیے اصلی چیز قرآن کے حسن نظم کا یقین ہے۔ اور تعجب ہے کہ جس قرآن میں یہ آیت بھی موجود ہے:۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۔ (محمد ۲۴)۔ کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہیں۔

اس پر غور و فکر کرنے سے کوئی شخص کیونکر بے پروا ہو سکتا ہے۔

اس تمہید سے مقصود یہ ہے کہ یہاں صرف یہ بات کہ خدا نے نماز اور قربانی کا ایک ساتھ ذکر

کیا ہے، ہم کو دعوت دیتی ہے کہ ہم ان دونوں کی باہمی مناسبت پر غور کریں۔ اسی اشارے نے ہمارے سامنے بے شمار حقایق حکمت کی راہ کھول دی ہم اس فصل میں ان کو بیان کرتے ہیں تاکہ ایک طرف آیت کا حسن نظم واضح ہو، اور دوسری طرف ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ دیکھ سکیں کہ قرآن کی جو سورتیں اپنے الفاظ کے اعتبار سے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اپنے معانی کے اعتبار سے بحر بے کراں ہیں۔ ذیل میں ان دونوں کی باہمی مناسبت کے تمام پہلوؤں کی تفصیل کی جاتی ہے۔

۱۔ نماز اور قربانی میں اسی طرح کی مناسبت ہے، جس طرح کی مناسبت ایمان اور اسلام میں ہے، یہ اجمال ہے؛ اس کی تفصیل سے پہلے ایک مختصر تمہید سن لینی چاہیے:۔

دین کی بنیاد علم وعمل کی صحت پر ہے۔ علم یہ ہے کہ ہم اپنے رب کو پہچانیں، اس کے ساتھ اپنے تعلق کو جانیں، اور پھر اس معرفت سے کبھی غافل نہ ہوں۔ اس علم سے لازماً محبت اور شکر کی ایک قلبی کیفیت وحالت پیدا ہوتی ہے، اسی قلبی کیفیت سے اعمال کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح گویا علم وعمل میں وہی تعلق ہے جو اثر اور موثر، ظاہر اور باطن میں ہوتا ہے یعنی علم باب ایمان سے ہے، اور عمل باب اسلام سے!

پھر ایک دوسری حقیقت پر غور کرو! عمل جس طرح علم کا مقابل ہے، اسی طرح قول کا مقابل ہے یعنی قول، علم وعمل کے بیچ کی کڑی ہے۔ قول ارادہ کا اولین ظہور اور عمل کا عنوان ودیباچہ ہے۔ اس تمہید کی روشنی میں، نماز اور قربانی کے باہمی تعلق پر غور کرو۔

نماز ظاہر ہے کہ قول واقرار ہے، یہ اٹھنا، بیٹھنا، جھکنا، سجدہ کرنا، ہاتھ اٹھانا انگلی سے اشارہ کرنا کیا ہے؟ یہ سب اداؤں کی زبان سے ہمارا قول وقرار ہے۔ یہ ایمان کے بعد، راہ اطاعت میں ہمارا پہلا قدم ہے۔ یہ اعمال کے دروازہ کی کلید ہے، اسی لیے یہ تمام شریعت کے دروازہ کا عنوان قرار دی گئی ہے۔ بکثرت آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ مثلاً۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ۔ جو غیب میں ایمان لاتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں۔

تفسیر سورۂ فاتحہ میں اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے۔

حضرت ابراہیم کے قصہ میں اس حقیقت کی پوری تشریح ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو، اس کی صفت توحید کے ساتھ پہچان لینے کے بعد فرمایا:۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام ۹) میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

نماز اسی توجہ الی اللہ کی عملی تصویر ہے۔ اسی وجہ سے ہماری نمازوں کا عنوان یہی مبارک کلمہ قرار پایا۔ یہی حقیقت حضرت موسیٰ کے قصہ میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توحید کی معرفت بخشنے کے بعد فرمایا:۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔ (طٰہٰ ۔ ۱۱۔۱۲۔۱۳۔۱۴) پس جب وہ اس کے پاس آیا، ندا آئی، اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں پس اپنے جوتے اتار دو تم وادی مقدس طویٰ میں ہو، اور میں نے تم کو برگزیدہ کیا ہے پس جو کچھ وحی کی جائے، اس پر کان دھرو۔ میں ہی اللہ ہوں میرے، سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔

ایک دوسرے مقام پر ابطال شرک کے بعد فرمایا:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ اپنا رخ یکسو ہو کر اطاعت الٰہی کی طرف سیدھا کرو۔ یہی اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا،

ذَالِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (روم ۳۰-۳۱)

اس میں فطرت الٰہی کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہے یہی فطرت کا سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اس کی طرف متوجہ ہوکر، اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو، مشرکین میں سے نہ بنو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز تمام مخلوقات الٰہی کی فطرت ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ۔ (بنی اسرائیل ۴۴)

ساتوں آسمان اور زمین، اور جو ان میں ہیں اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور ہر شے اس کے حمد کی تسبیح پڑھتی ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيْحَهُ۔ (نور ۴۱)

نہیں دیکھتے کہ جو آسمان و زمین میں ہیں، سب اللہ کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور چڑیاں قطار در قطار، ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح جان لی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تمام اعمال میں سے، نماز ایمان سے سب سے زیادہ اقرب، بلکہ ایمان کا اولین فیضان ہے۔ یہ بیک وقت توحید، انابت، شکر، توکل اور تبتل الی اللہ کا شیرازہ اور تمام مخلوقات الٰہی کی فطرت ہے۔

اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو! قربانی حقیقت اسلام کی جامع ہے۔ اسلام کا مفہوم، اطاعت سرفگندگی، اور نفس کو بالکلیہ مولیٰ کے حوالہ کر دینا ہے۔ نماز کی طرح یہ بھی بندوں کی فطرت ہے، کیونکہ تمام مخلوق امر الٰہی کی اطاعت سے وجود میں آئی ہے۔ خدا نے کلمہ "کن" کے ذریعہ حکم دیا اور تمام مخلوق بدء خلقت میں اس کلمہ کی اطاعت سے وجود میں آئی۔ اب اگر وہ خدا کی نافرمانی کرے، تو اپنی فطرت

کی خلاف ورزی کرے گی۔ اس اعتبار سے اسلام تمام کائنات کو محیط ہے۔

وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ (آل عمران ۸۳) آسمان اور زمین میں جو ہیں، سب طوعاً و کرھاً اسی کے سامنے سرفگندہ ہیں اور اسی کے پاس سب لوٹائے جائیں گے

یعنی بدء خلقت میں تم نے اس کے امر کی تعمیل کی، اسی طرح آخرت میں تم اس کے حکم پر دوڑو گے۔

چنانچہ فرمایا ہے۔

اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (روم ۲۵) جب وہ تم کو زمین سے نکلنے کے لیے ایک بار پکارے گا۔ دفعۃً تم نکل کھڑے ہوگے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل ۵۲) اور تم اس کی حمد کے ساتھ اس کی پکار پر دوڑو گے اور گمان کروگے کہ نہیں تم ٹھیرے مگر بہت کم۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اور تسبیح و سجدہ اور نماز دونوں عین فطرت اور باہم گر نہایت قریبی رشتہ دار ہیں۔

جب حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے ہمارا امام، ان کی مسجد کو ہمارا قبلہ اور ان کے طریقہ کو ہمارے لیے دستور العمل بنایا تو ایک واقعہ بیان کرکے قربانی کی حقیقت بھی آشکارا کردی جس سے ضمناً نماز کے باطن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا۔

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ ۔ . . . . میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں، وہ میری رہبری فرمائیگا۔ (یعنی میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہ مجھپر اپنی راہ کھولے گا)۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ اے پروردگار مجھے صالحین میں سے بخش۔ (یعنی اولاد

صالح، تاکہ میں ان کو لیکر تیری راہ پر چلوں، اور لوگوں کے لیے حق و ہدایت کی راہ باز ہو)۔

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پس ہم نے اس کو ایک حلیم لڑکے کی ولادت کی بشارت دی (یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی۔ اسمٰعیل کے معنی ہیں: "اللہ نے سُنا" چونکہ ان کی ولادت ابراہیم کی دعا کے مطابق ہوئی تھی، اس لیے ان کا نام اسمٰعیل رکھا گیا)۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب وہ اس عمر کو پہنچے کہ ان کے ساتھ دوڑ پھر سکیں انھوں نے کہا: بیٹے! میں نے خواب میں یوں دیکھا کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں (یعنی اللہ کے لیے) اب تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ (یہ سوال اس لیے تھا کہ اس طاعت میں فرمان بردار بیٹا بھی شریک ہو جائے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ ہمیشہ کیلیے تسلیم و اطاعت الٰہی کی ایک راہ کھول رہے تھے، اور چونکہ اطاعت شعار فرزند دعا ہائے سحر کی قبولیت تھا، اس لیے اس کا عاقل و حلیم ہونا یقین تھا اور کسی اختلاف کا خدشہ نہ تھا)۔

قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے جواب دیا: والد ماجد! جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل فرمائیے انشاء اللہ آپ مجھکو ثابت قدموں میں پائیں گے۔ (حضرت اسمٰعیل سمجھ گئے کہ ان کو حکم الٰہی کی تعمیل میں ذبح کیا جا رہا ہے۔ اس لیے انھوں نے وہ جواب دیا جو متوکلین کے شایان شان تھا)۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پس جب دونوں امر الٰہی کے سامنے جھک گئے، اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔ (یعنی اس طرح دونوں نے اپنے کمال اطاعت و اسلام کو مشہود کر دیا، کیونکہ باپ نے اس چیز کو قربان کرنے کا عزم کر لیا، جو اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی، اور بیٹے کی کل کائنات صرف اس کی جان تھی)۔

وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ اور ہم نے اس کو پکارا، اسے ابراہیم! تم نے خواب کو

الرُّؤْيَآءَ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۔ اِنَّ هٰذَا — سچ کر دکھایا بیشک ہم محسنین کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں،
لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ — بلاشبہ کھلی ہوئی جانچ یہی ہے (اس اطاعت کاملہ نے

ان کو درجہ احسان کی سرفرازی بخشی، اور یہی کمال اسلام ہے، اس امتحان کے بعد ان دونوں کو خدا نے قوموں کا امام اور ہادیوں کا رہبر بنایا۔

وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (صفت ۹۹ تا ۱۰۱) — اور ہم نے اس کو بڑی قربانی کے عوض چھڑا لیا (یعنی اس قربانی کی یادگار میں، قربانی کی عالمگیر اور عظیم الشان سنت قائم کی، جو قربانی کرنے والوں کی مغفرت کا وسیلہ ہے)۔

اس واقعہ میں خدا نے ہمارے سامنے یہ حقیقت کھولی ہے کہ اسلام کی روح، اطاعت اور اپنی عزیز سے عزیز متاع حتیٰ کہ جان کو بھی خدا کے حوالہ کر دینا ہے، اور یہ بات بغیر کامل ایمان و اخلاص کے وجود میں نہیں آسکتی، پس گویا ان دونوں کا رتبۂ کمال مقام احسان ہے۔ احسان کی حقیقت یہ ہے کہ "اعبد ربک کانک تراہ" اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی اور نماز میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایمان و اسلام میں یا قول و عمل میں ہے، اور احسان ان دونوں کا نقطۂ اتصال ہے۔

۲۔ نماز اور قربانی میں وہ نسبت ہے، جو نسبت زندگی اور موت میں ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نماز کی حقیقت یاد الٰہی ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔ (طٰہٰ ۱۴) — اور میری یاد کیلئے نماز قائم کرو۔

دوسری جگہ ہے:۔

ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۔ (اعلیٰ ۱۵) — اپنے رب کے نام کو یاد کیا، پس نماز پڑھی۔

قرآن مجید میں اس طرح کی آیتیں بہت ہیں، اور مقصود دوام ذکر الٰہی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔ (آل عمران ۱۹) — جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے۔

نیز فرمایا:—

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا - (احزاب ۴۱ تا ۴۳)

اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو، اور صبح و شام اس کی تسبیح پڑھو۔ وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لیجائے، اور وہ مومنین کے ساتھ مہربان ہے۔

یعنی جس طرح تم اس کی یاد کرتے ہو، اور اس کی تسبیح پڑھتے ہو، اسی طرح وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں جس سے تمہاری روشنی بڑھتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ - (بقرہ ۱۵۲) پس مجھکو یاد کرو اور میں تمکو یاد کروں گا۔

نیز فرمایا:—

فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْــَٔمُوْنَ ۔ (حم سجدہ ۳۸)

جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں، وہ رات دن اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور کسی وقت اس سے برداشتہ خاطر نہیں ہوتے

یہی راز ہے کہ ہمارے رات دن کے تمام اوقات نمازوں سے گھیر دیئے گئے ہیں۔ اور کسی حالت میں اس سے معافی نہیں دی گئی ہے۔ نماز سانس کی طرح زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ حقیقی زندگی جو نور، سکینت اور ایمان کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے، صرف اللہ کی یاد ہی سے باقی رہ سکتی ہے غور کرو تو عقلاً یہ بات بالکل واضح ہے کیونکہ بندوں کو عقل و تمیز کی صلاحیت بخشدینے کے بعد خدا کی نظر رافت ان کی طرف اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی توجہ و انابت سے اس کو دعوت نہ دیں۔ اس کا دستور یہ ہے کہ جب بندہ شکر کرتا ہے اور پائی ہوئی نعمتوں کو کام میں لاتا ہے تو وہ نعمت کو زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:—

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد ۱۷) جو طلب ہدایت میں سرگرم رہتے ہیں، ان کے نور ہدایت کو بڑھاتا ہے۔

توجہ الی اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے نام کی یاد کی جائے۔ خدا کے تقرب کی راہ یہی ہے۔ اللہ سے قربت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کو یاد رکھا جائے اور اس سے دوری کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد سے غفلت ہو جائے (اعاذنا اللہ منہا) جب بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے اس سے قریب ہو جاتا ہے جیسا کہ فرمایا

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ (علق-۱۹) سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔

اس وقت اللہ کی نظر رحمت اس کو نوازتی ہے، اور اس کا سینہ انوار قدس کا مہبط بن جاتا ہے روح ذکر و فکر کی گہرائیوں میں جس قدر ترقی جاتی ہے زندگی اور قوت کے لازوال خزانوں سے اسی قدر قریب ہوتی جاتی ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں اسی حقیقت کی خبر دی گئی ہے۔

مایزال العبد یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی بہ یسمع وبصرہ الذی بہ یبصر ویدہٗ التی بہا یبطش۔

بندہ نوافل کی راہ سے برابر میری طرف بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں، اور جب میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔

یہ اسی روحانی زندگی کا بیان ہے، جو حقیقی اور واقعی زندگی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز حقیقی زندگی کا سرچشمہ اور اس حیات نقلی سے نجات حاصل کرنے کا زینہ ہے اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو۔ اس کا اصلی مفہوم۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ سے ظاہر ہے نفس کو اللہ کے حوالہ کرنا ہے، یہ تسلیم و اطاعت کے ایک عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے اور اس میں زبردست امتحان کی سرگذشت پنہاں ہے جس میں خدا نے ابراہیم خلیلؑ کو آزمایا تھا۔ اہل ایمان راہ الٰہی میں اپنی جانیں قربان کر کے اسی اطاعت و عبدیت کی یادگاریں قائم کرتے ہیں پس جس طرح نماز اللہ کے ساتھ ہماری زندگی ہے اسی طرح قربانی اس کی راہ میں ہماری موت ہے۔ اور یہی حقیقی

دین اور حقیقی اسلام ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

کہدو میرے رب نے مجھکو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ سیدھے اور فطری دین۔ دین ابراہیم کی جو صرف اللہ کا پرستار تھا، کہدو میری نماز، میری قربانی میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

(انعام ۱۶۱ - ۱۶۲)

باتفاق تمام مفسرین اس آیت میں "نسک" سے مراد حج اور عمرہ میں قربانی کرنا ہے۔ لغت عرب سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے یہاں "صلوٰۃ" اور "نسک" کو ایک ساتھ رکھا ہے، اور اس کے بعد علی الترتیب "محیا اور ممات" کے الفاظ ہیں، یہ نظم کلام توافق کے اصول پر ان دونوں کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کو بے نقاب کرتا ہے، یعنی نماز مسلم کی زندگی ہے اور اس کی قربانی راہ الٰہی میں اس کی موت ہے۔ پھر غور کرو تو یہ دونوں بالکل ایک ہیں، کیونکہ یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ (بقرہ ۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں، ان کو مردہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔

۴۔ نماز اور قربانی "حقیقی قربانی" کے دو بازو ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو صاحب عقل و ارادہ اور خیر و شر میں تمیز کرنے والا بنایا، تو ایک طرف تو اس کو عظمت و رفعت کا وہ مقام بلند بخشا جس سے برتر اور بلند کوئی مقام نہ تھا، اور دوسری طرف ذلت و پستی کے اس کنارہ پر کھڑا کر دیا جس سے بڑھ کر کوئی ذلت و پستی نہ تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ

بے شک ہم نے آدمی کی ساخت اچھی سے اچھی بنائی، پھر ہم نے اسے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں ڈالدیا، مگر جو

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۔ (تین ۔ ۴۔۵۔۶) ۔	جو کہ ایمان لائے، اور بھلائیاں کیں، سو انھیں ہمیشہ کے لیے انعام ملے گا ۔

نیز فرمایا :—

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (شمس ۔ ۷۔۸۔۹۔۱۰)	اور شاہد ہے نفس اور اس کا تسویہ، چنانچہ اس کو اسکی بدی اور نیکی الہام کی جس نے اس کو سنوارا، اس نے فلاح پائی، جس نے اس کو خاک میں ملایا، وہ نامراد ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ جب اس منعم حقیقی سے بے پروا ہو جاتا ہے، جمال الٰہی کی روشنی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور وہ باطل کے دام فریب میں پھنس کر اپنے تئیں ہوائے نفس کے حوالہ کر دیتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے :۔

اَفَمَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (جاثیہ ۲۳)	کیا وہ جس نے اپنی خواہش کو معبود بنالیا ہے، اور خدا نے اس کو علم دینے کے باوجود گمراہ کر دیا ہے ۔

یعنی اس نے عقل، آنکھ، کان پاکر گمراہی کی راہ اختیار کرلی ہے، جیسا کہ سورہ دہر میں ہے ۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۔ (دہر ۲۔۳)	ہم نے آدمی کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا، اس کو مختلف اطوار میں الٹتے پلٹتے رہے ۔ پس اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا، بیشک ہم نے اس کو راہ سجھا دی

چاہے وہ شکر گذار بنے یا ناشکری کی راہ اختیار کرے ۔ (یعنی اگر وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو کام میں نہ لائے گا ناشکری کی راہ اختیار کرے گا)۔

وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى قَلْبِهٖ غِشَاوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ	اور اس کے کان، آنکھ پر مہر کر دی ہے، اور اس کے دل پر پردہ ڈال دیا ہے ۔

اللہ کے بعد اس کو کون ہدایت کی راہ دکھائے گا۔ کیا تم سوچتے نہیں؟ یعنی جب اس نے خدا سے منہ پھیر لیا، اپنے نفس کا غلام بن گیا تو خدا نے اس کو اس کی خواہشوں کے حوالہ کر دیا، جو اس کے قلب کے لیے حجاب بن گئی ہیں۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۔ (مطففین ۱۴-۱۵)

ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی جم گئی ہے۔ ہرگز نہیں! وہ اس دن اپنے پروردگار کے دیدار جمال سے محروم ہوں گے۔

یعنی جس طرح وہ اس حیات دنیاوی میں خدا کے نور ایمان سے محروم تھے، اسی طرح حیات اخروی میں اس کے دیدار جمال سے اوٹ میں ہوں گے۔ آدمی جو کچھ چاہتا ہے خدا کی طرف سے وہی پاتا ہے جنہوں نے نفس اور شہوات نفس کی غلامی پسند کی، وہ نفس کے غلام بن گئے؛ اور قیامت کے دن نفس کی حقیقت ہی سے دوچار ہوں گے۔ یعنی ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ؛ پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔

اس حالت کی وجہ سے انسان کے لیے ضروری ہوا کہ نفس کے صنم اکبر کو توڑے، اور جنہوں نے نفس کی حقیقت پر غور کیا ہے، ان کو معلوم ہے کہ نفس کے دو بازو ہیں: سبعیت اور بہیمیت۔ اس لیے ضروری ہوا کہ انسان کو ان دونوں بازوؤں کے توڑنے کی تدبیر بتائی جائے۔ اب ان دونوں کی تفصیلات پر غور کر و!

۱۔ اول یعنی سبعیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ اللہ کے حضور خشوع و تذلل اور نماز کی پابندی ہو۔ نفس کے کبر و نخوت کا سر صرف نماز سے کچلا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خشوع نماز کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۔ (مومنون ۱-۲)

بیشک ان ایمان والوں نے فلاح پائی، جو اپنی نمازوں میں خدا کے سامنے سرافگندہ ہیں۔

نیز فرمایا ہے :-

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ۔

اپنے رب کو دل میں یاد کرو، گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور پست آواز میں صبح اور شام، اور بیخبروں میں سے مت بنو۔ جو لوگ تمہارے رب کے پاس ہیں وہ اس کی زندگی سے ابا نہیں کرتے۔ اور اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

(اعراف ۲۰۵-۲۰۶)

دوسرے مقام پر ہے :-

وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا۔ (فرقان ۶۳-۶۴)

اور خدائے رحمان کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر خاکساری کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب جاہل ان کو مخاطب کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں تم پر اللہ کی سلامتی ہو، اور جو اپنی راتیں خدا کے حضور سجدہ و قیام میں بسر کرتے ہیں

اس آیت پر غور کرو۔ اس میں نماز سے پہلے ان کی خاکساری کا تذکرہ کیا ہے کیونکہ نماز کی حقیقت نفس کو نخوت سے پاک کرتا ہے، جو لوگ برابر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، اور خدا کے جلال وجبروت اور اس کی نعمت و رحمت کی یاد تازہ رکھتے ہیں، ان کے چہروں سے تواضع اور محبت کا جمال ٹپکتا ہے۔ اسی قسم کا نظم اس آیت میں ہے :-

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا۔ (فتح ۲۹)

محمد اللہ کا رسول۔ اور جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں نرم دل ہیں، تم ان کو دیکھو گے رکوع اور سجدہ میں۔

یہاں ابطال رہبانیت کی غرض سے پہلے 'شدت' کا ذکر کیا ہے، کیونکہ جو خدا سے محبت کرتا ہے اس کا دل اس مقام کی بے پایاں عظمتوں کے احساس سے اس قدر لبریز ہو جاتا ہے کہ اس میں دوسروں کی عظمت و بڑائی کے خیال کی سمائی نہیں رہ جاتی اس لیے وہ تمام مخالفتوں سے بخوف اور نڈر ہو کر علی الاعلان اس کی شہادت دیتا ہے پس اس جگہ 'شدت' کا ذکر محض ایک وہم کے ازالہ کے لیے ہے کیونکہ تذکرہ ایک ایسی امت کا ہو رہا تھا جو اعتدال کے نقطۂ کمال پر ہے۔ آیت میں مسلمانوں کی وہ صفات بیان ہوئی ہیں، جو توراۃ و انجیل میں مذکور ہیں، اور جو اس کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امتوں سے متمیز کرتی ہیں ضمناً اس میں کمال عدل و اعتدال اور جمع بین الضدین کی اس فضیلت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔ جو امت مرحومہ کی خصوصیات خاصہ میں سے ہے، اور جس کے بعد فضیلت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہجاتا، پس اس جگہ شدت کے ذکر سے محض اس صفت تواضع و رحمت کی تصحیح مقصود ہے، جس کا سرچشمہ خشیت الٰہی ہے، کیونکہ خدا کی خشیت تمام خوفوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ۔ (آل عمران ۱۷۵) پس ان سے مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرو۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (مائدہ ۳) پس ان سے مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرو۔

اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں۔

۲۔ دوسرے بازو یعنی بہیمیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ نفس اس دنیا کی جن مرغوبات میں لذت پاتا ہے، ان سے اس کو علیحدہ کیا جائے۔ اس کے تین درجے ہیں:۔

پہلا یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان قربان کی جائے، اس کا بلند ترین مقام لخت جگر کی قربانی ہے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے جانچا گیا، جو ان کی محبوب ترین اولاد تھے، چنانچہ جب فرشتہ نے ان کو حضرت اسحاق کی ولادت کی خوشخبری دی، انھوں نے کہا "اسمٰعیل زندہ رہے" جس سے حضرت اسمٰعیل کے ساتھ ان کی بے اندازہ محبت کا جوش ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ طاعت الٰہی کی راہ میں مصائب و آلام جھیلے جائیں، اور لذات سے کنارہ کشی اختیار کی جائے، کیونکہ زندگی کے بعد نفس کو سب سے زیادہ محبوب لذات ہی ہیں۔ روزہ اس منزل میں بہترین رہبر ہے۔ مقام قربانی کے مدارج میں سے ضعفاء طریق کی پہنچ اسی درجہ تک ہے۔ اسی لیے جب حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ سب سے بلند درجہ کے حصول کی راہ کیا ہے تو انہوں نے فرمایا یہ روزہ اور نماز سے حاصل ہوتا ہے۔

تیسرا درجہ بذل مال کا ہے، جو تمام لذات کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس منزل میں رہبر زکوٰۃ ہے متعینہ زکوٰۃ سے زیادہ خرچ کرنے میں ایک پہلو سبب کبر کے ابطال کا بھی ہے۔ چونکہ مقصود نفس کی بیت نفس کو ان چیزوں کی غلامی سے چھڑانا ہے جن کی لذتیں اس پر گھیرے ڈالتی ہیں اس لیے ضروری ہوا کہ خدا کی راہ میں وہ چیز خرچ کی جائے جو نفس کو محبوب ہو۔ اسی لیے فرمایا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔۔ تم اس وقت تک نیکی کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو، جو تمھیں محبوب ہیں۔ (آل عمران - ۹۲)

یہ جو قربانی کے جانوروں کو فربہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں بھی یہی حکمت مرعی ہے حضرت ابراہیمؑ کو محبوب ترین اولاد کے ذبح کا حکم دے کر یہ حقیقت بالکل آشکارا کر دی گئی چونکہ قربانی کا حقیقی مرتبہ کمال جان کی قربانی تھا، اس لیے خون بہانا اس کی علامت قرار پایا اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نماز اور قربانی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ذبح نفس کے دو پہلو ہیں، ایک حدیث میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

قربان ھذہ الامۃ بدمائھا وصلوتھا اس امت کی قربانی بذل نفس اور نماز کے ذریعہ ہے

(۱۱ ق)

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

"اشاعت گذشتہ میں، ڈاکٹر سیادت علی صاحب (استاذ قانون، کلیہ جامعہ عثمانیہ) کے خطبۂ صدارت کے متعلق ایک مفصل استفسار، جناب مولوی ابوالخیر محمد خیراللہ صاحب کی جانب سے شائع ہو چکا ہے، جس میں مسائل بحث طلب (سود، پردہ، طلاق اور مہر) کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی اصل عبارتیں بھی نقل کر دی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس چند اور استفسارات بھی آئے ہیں، مگر ان سب کو شائع کرنا موجب تطویل ہوگا۔ آیندہ صفحات میں ہم ان مسائل کے متعلق ایک جامع اور مفصل بحث کریں گے، جس میں امید ہے کہ تمام حضرات مستفسرین کے پیش کردہ سوالات کا جواب آجائے گا۔"

یہ امر ایک گونہ موجب اطمینان ہے کہ ہماری جدید تعلیمیافتہ جماعت میں زندگی کے مسائل کو تہذیب مغربی کے اصول و نظریات کے بجائے اصول اسلام کے مطابق حل کرنے کا میلان پایا جاتا ہے، اور اسی لیے وہ ہر اس مسئلہ میں جو ان کے نزدیک اہمیت رکھتا ہے، اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مطالعہ، تحقیق، اور غور و فکر کی جو کم سے کم حد ہونی ضروری ہے، اور جس کو وہ خود اپنی علمی تحقیقات میں ملحوظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اس کو اسلامی مسائل پر بحث کرنے میں ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اجتہاد کی کوشش کی جاتی ہے جو بجائے خود کوئی نامحمود شے نہیں ہے۔ نہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو اس کو شجر ممنوع سمجھتے ہیں، لیکن اس کے لیے جو ضروری اور ناگزیر شرائط

ہیں ان میں سے کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اصول اسلامی کو جدید حالات وضروریات پر منطبق کرنے اور اس طریقے کے زندگی کے جدید مسائل کو حل کرنے کے لیے اب تک جتنے اقدامات اس گروہ کی طرف سے کیے گئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی اتنی صلاحیت استواری اور قوت موثرہ نہ پائی گئی کہ تہذیب اسلامی کا مزاج اس کو قبول کرتا اور امت مسلمہ کی زندگی میں اس سے کوئی مفید انقلاب رونما ہوتا۔ بلکہ اس قسم کے غیر محققانہ اجتہادات نے، جن کی بنیاد ناکافی مطالعہ اور ناکافی غور و فکر پر قائم ہوتی ہے، ملت کے مزاج پر وہی اثر کیا ہے جو کسی کمزور مریض کو کچی یا ادھ کچری غذا دینے سے ہوتا ہے۔ ضعف اور اضمحلال تو دور نہ ہوا کیونکہ وہ غذا ایسی ہی نہیں جو خون صالح بناتی، اور جسم میں زندگی کی تازہ روح پھونکتی۔ البتہ پہلی شکایات پر سوء ہضم، بحران اور اختلال دماغی کا اور اضافہ ہوگیا!

اس تنقید سے ہمارا مقصد کسی کی تنقیص نہیں، بلکہ ہم اپنی قوم کے جدید تعلیم یافتہ گروہ کو اس کی اصلی کمزوری سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر ایک مدت سے جو ضعف و اضمحلال اور جمود و خمود طاری ہے وہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان میں جہاد و اجتہاد کی وہ روح بیدار نہ ہو جائے جو ان کی تہذیب کو پھر سے ایک متحرک اور نامی تہذیب بنا دے۔ لیکن جب ہم ان لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں جن سے اس باب میں کوئی امید وابستہ کی جا سکتی ہے، تو ساری امیدیں مایوسی سے بدل جاتی ہیں۔ ایک طرف علماء ہیں جن کے پاس دین کا علم ہے، علوم اسلامی کے مآخذ اصلیہ تک دسترس ہے، مجتہدین سلف کے آثار و نقوش سے استفادہ کرنے کے وسائل ہیں، تحقیق کی استعداد ہے، غور و فکر کے مواقع ہیں، مگر اجتہاد کی روح نہیں، تحقیق کا شوق نہیں، حتیٰ کہ اگلوں کے بنائے ہوئے راستوں سے ایک قدم آگے بڑھنے کی بھی ہمت نہیں۔ دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات ہیں جن میں تحقیق کا شوق ہے، اجتہاد کی روح ہے، جدید ضروریات کے لحاظ سے پیش قدمی کرنے اور نئے راستے نکالنے کی خواہش اور جرأت ہے، مگر اسلام کا علم نہیں، تحقیق کے وسائل تک دسترس نہیں

اسلامی ذہنیت اور اسلامی طریق فکر و نظر سے بہرہ نہیں، اور کم سے کم اتنی علمی واقفیت بھی نہیں جس سے وہ یہ سمجھ سکیں کہ اسلام کے حدود میں تحقیق و اجتہاد کی گنجائش کہاں تک ہے اور کہاں اپنچ کر پیش قدمی حدِ اسلامی سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ ان دونوں گروہوں سے مایوس ہونے کے بعد اگر کوئی امید وابستہ کی جا سکتی ہے تو اس نہایت قلیل التعداد گروہ سے جو علوم قدیمہ و جدیدہ کا جامع ہے۔ لیکن اس گروہ کا جو نمونہ ڈاکٹر سیادت علی صاحب نے پیش کیا ہے اس کو تو کسی حیثیت سے بھی امید افزا نہیں کہا جا سکتا۔ وہ محض ڈاکٹر ہی نہیں، ماشاء اللہ مولوی فاضل بھی ہیں۔ یورپ کی ایک بہترین یونیورسٹی میں تحقیق و اجتہاد کی باقاعدہ تربیت پا چکے ہیں۔ ہندوستان کی ایک بہترین یونیورسٹی میں قانون جیسے اہم مضمون کے پروفیسر ہیں، ان کے پاس تحقیق کے ذرائع بھی ہیں، مواقع بھی، اور اعلیٰ تربیت یافتہ صلاحیت بھی، مگر اپنے خطبہ میں چند مسائل پر انھوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے جو بحث کی ہے اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کو نہ انہوں نے سمجھا نہ ان پر غور کیا نہ ان کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات بہم پہنچائیں، اور اس کے باوجود ان مجتہدانہ انداز میں کلام فرمایا، اور یہ تک محسوس نہ کیا کہ کہاں کہاں ان کا اجتہاد اصول سے متجاوز ہو کر ابتداع بن گیا ہے۔

سود کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہی وہ اس طرح فرماتے ہیں کہ قرآن کے حکم تحریم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بشدت منع فرمانے کے باوجود مسلمانوں میں "دور اول ہی سے اس کی شروعات کا پتہ چلتا ہے" اور یہ کہ اس زمانہ میں "ایک نہ ایک شکل میں سود کا لین دین ہوتا تھا" اور وہ دور گذر جانے کے بعد "تو مسلمانوں میں سود کا رواج عام ہو گیا"۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟ یہ کہ "امام مالک کی مدونہ میں سود پر سینکڑوں مسائل کا ذکر ہے"۔ "حضرت ابن عباس بصرہ سے مکہ تک سفاتج پر کچھ زائد لینے کو جائز سمجھتے تھے"۔ "امام ابو یوسف حیل شرعی کے ذریعہ سے سود لینے کو پسند فرماتے تھے"۔ "شاہ عبد العزیز صاحب نے "دار الامان و دار الاسلام کے مسئلہ کی بنا پر جواز سود کا فتویٰ دیا ہے" اور ان سب سے بڑھ کر

یہ کہ "سود کی وسعت اور اس کے حدود کے متعلق خود حضرت عمرؓ کو شبہ رہا ہے" اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں صرف اس سود کو حرام قرار دیا گیا ہے جو "اضعافاً مضاعفۃ" (؟ مضاعفۃً) یعنی سود در سود ہو اور مشہور و مستند حدیث الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ کا منشا دراصل مبادلہ کو ختم کرنا اور بیع کو رواج دینا اور عربستان میں ایک واحد سکہ کی ترویج تھا۔ یہ تمام باتیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ فاضل پروفیسر نے اس مسئلہ کے متعلق کافی مطالعہ کر کے اتنا مواد بھی فراہم نہیں کیا جو اس پر کلام کرنے کے لیے کم از کم ضروری تھا۔

اگر وہ "امام مالک کی مدونہ" کو دیکھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اس میں سود کے متعلق جتنے مسائل بیان کئے گئے ہیں سب کے سب سود کے تمام ممکن ابواب کو بند کرنے کے لیے ہیں نہ کہ ان کو کھولنے کے لیے، البتہ بعض جزئیات میں بظاہر سود کا جو شبہ ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ حنفی اور فقہ مالکی میں تھوڑا سا اختلاف ہے، حنفیہ نے حدیث الذھب بالذھب الخ میں علت حکم قدر و جنس کو قرار دیا ہے اور مالکیہ نے اقتیات و ادخار کو۔ اس بنا پر بعض صورتیں ایسی نکل آتی ہیں جو حنفیہ کے نزدیک سود کی حد میں آجاتی ہیں مگر مالکیہ کے مذہب میں وہ سود نہیں ہیں۔

سفاتج کے متعلق ابن عباسؓ سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اگر قرض میں سفتج لکھنا مشروط ہو تو حرام ہے" اور اگر مشروط نہ ہو بلکہ قرض لینے والا بطور خود سفتج لکھ دے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ ابن ابی شیبہ نے تمام صحابہ اور ائمہ سلف کے متعلق لکھا ہے کہ کانوا یکرھون کل قرض جر منفعۃ۔ اسی باب میں سفاتج بھی آجاتے ہیں۔

امام ابو یوسف پر اس سے بڑھ کر کوئی تہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ حیل شرعی سے سود لینے کو "سند" فرماتے تھے۔ بلاشبہ انہوں نے حیل میں ایک کتاب لکھی ہے، جو بالکل فنی چیز ہے، لیکن امام صاحب اور تمام بزرگان حنفیہ نے تصریح فرمائی ہے کہ شرعی حیلوں کا استعمال حرام سے بچنے اور گناہ سے دور ہونے

کے لیے کرنا چاہیے نہ کہ تکالیف شرعیہ سے بچنے اور ابطال حق و اثبات باطل کے لیے۔ اس تصریح کے بعد اگر کوئی کہے کہ سود فلاں فلاں حیلوں سے کھایا جا سکتا ہے، یا زکوٰۃ سے بچنے کی فلاں فلاں صورتیں ممکن ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ کہنے والا ایسا کرنے کو "پسند" کرتا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قائل کی رائے میں اگر کوئی ایسا کرے تو قانون کی گرفت سے بچ سکتا ہے، یا بالفاظ دیگر خواہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے ساتھ کچھ ہی معاملہ پیش آئے مگر دنیا میں اس کو سود خواری کا الزام دینے یا اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرنے کے لیے کوئی قانونی گنجائش نہیں ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے متعلق یہ انکشاف بالکل جدید ہے کہ انہوں نے دارالحرب میں "جواز سود" کا فتویٰ دیا تھا۔ کسی چیز کو سود قرار دینے کے بعد اسے "جائز" کہنے کی جرأت شاہ صاحب تو درکنار اگر کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی کرتی تو تمام امت بالاتفاق اس کو کافر قرار دیتی کیونکہ یہ تو قرآن کا انکار ہے۔ مسئلہ جس کو اس قدر غیر قانونی الفاظ میں ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے دراصل ان الفاظ کے ساتھ کتب فقہیہ میں آیا ہے کہ "مسلم اور کافر کے درمیان دارالحرب میں جو معاملہ ہو اس پر سود کا اطلاق نہیں ہوتا"۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے بہت پہلے امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ یہ فتویٰ دے چکے ہیں، اور ان کی اپنی ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ حدیث لا ربا بین المسلم والحربی فی دارالحرب اس کا ماخذ ہے۔ امام ابویوسف، شافعی، مالک اور احمد رحمہم اللہ کے نزدیک یہ حدیث ثابت نہیں، لیکن امام اعظم اور ان کے جلیل القدر شاگرد کے نزدیک یہ حدیث قابل اعتماد ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ شائد نہ کہا جاتا اگر آپ کے اصل الفاظ پیش نظر ہوتے۔ آپ نے سود کے متعلق دراصل یہ فرمایا تھا کہ۔

ان آیۃ الربا من آخر ما نزل من القرآن وان النبی صلعم قبض قبل ان یبینہ | آیت ربا قرآن مجید کی آخری نازل شدہ آیات میں سے ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل اس کے کہ

لَنَا فدعوا الربا و الريبة۔ اس کے احکام پوری طرح واضح فرماتے، وفات پا گئے
اس لیے تم سود بھی چھوڑو اور جس چیز میں سود کا شبہ ہو۔ اسے بھی چھوڑ دو۔

اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمر کے نزدیک چونکہ بعض ابواب میں شبہ تھا کہ وہ ربا کی حد میں آتے ہیں یا نہیں، اس لیے آپ تاکید فرماتے تھے کہ جس چیز میں ربا کا شبہہ بھی ہو اس کو چھوڑ دو تاکہ کہیں نادانستہ تم حرام میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس قول سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ ربا کی وسعت اور اس کے حدود چونکہ حضرت عمر جیسے ماہر احکام شریعت تک کے نزدیک مشتبہ تھے اس لیے بجز ربا کی اس خاص شکل کے جس کو خاص طور پر قرآن مجید میں حرام فرمایا گیا ہے، باقی تمام اقسام کے سود ھنیئًا مریئًا کھاؤ اور اپنے ضمیر پر سے اس کی ممانعت کے بار گران کو بھی اٹھا دو تاکہ اندر سے کبھی دل بھی ملامت نہ کرے!

یہ ارشاد کہ قرآن میں صرف سود در سود کی ممانعت کا حکم ہے، اگر دانستہ تحریف نہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قائل نے قرآن مجید کو پڑھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ قرآن مجید میں ایک جگہ مطلقاً ربا سے باز رہنے کا حکم دیا گیا ہے (بقرہ، رکوع ۳۸) اور دوسری جگہ خاص طور پر سود در سود کھانے کو منع کیا ہے (آل عمران رکوع ۱۴)۔ ان میں سے ایک کو چھوڑ کر دوسری آیت سے استدلال کرنا۔ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ۔ کا مصداق ہے قرآن مجید کا انداز بیان یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ ایک ہی چیز کو منع کرنے کے لیے اس کی کسی خاص بدترین صنف کو لے کر اس سے منع کرتا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ صرف وہی خاص صنف حرام ہے اور باقی سب حلال ہیں مثلاً قتل اولاد سے جہاں منع کیا گیا ہے وہاں ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ "اپنے بچوں کو مفلسی کے خوف سے مت قتل کرو"۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی اور غرض کے لیے بچوں کو قتل کرنا ممنوع نہیں ہے۔ ایسی اور بہت سی مثالیں قرآن میں موجود ہیں اس قسم کی آیات میں جو شخص معنی کو نظر انداز کر کے سراسر لفظ پر نگاہ رکھے گا وہ خدا جانے کن کن مکروہات و منہیات میں مبتلا ہو جائے گا۔ پھر اگر

ایسی ہی لفظ کی پابندی کرنی ہے تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ سود در سود بھی صرف "کھانا" ممنوع ہے، باقی رہا کپڑے بنانا مکان تعمیر کرنا اور موٹر خرید نا وغیرہ تو ان اغراض کے لیے سود در سود لینا ہرگز ممنوع نہیں کیونکہ قرآن میں لَا تَاْكُلُوْا (نہ کھاؤ) کہا گیا ہے لَا تَاْخُذُوا (نہ لو) نہیں کہا گیا۔

الذهب بالذهب والفضة بالفضة الخ سے شارع کا جو منشا ڈاکٹر صاحب نے سمجھا ہے، اس کی غلطی محض پوری حدیث کے الفاظ پڑھ لینے ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔

الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ يداً بيدٍ فاذا اختلفت هٰذه الاجناس فبيعوا كيف شئتم اذا كان يداً بيدٍ

سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا مبادلہ چاندی سے، گیہوں کا گیہوں سے، جو کا جو سے، کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مثل اور ایک دوسرے کے مساوی ہوں اور دست بدست لین دین ہو جائے۔ البتہ اگر ان اجناس میں اختلاف ہو تو تم جس طرح چاہو بیچ سکتے ہو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔

اس حدیث سے شارع کا یہ منشا سمجھنا کہ "مبادلہ" موقوف کیا جائے اور زرِ ستان میں ایک واحد سکہ کی ترویج ہو، صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جس نے کہیں صرف "الذهب بالذهب والفضة بالفضة" کے الفاظ پڑھ لیے ہوں اور کتب حدیث میں پوری روایت نکال کر دیکھنے کی زحمت نہ اٹھائی ہو، ورنہ یہ تو قطعاً بعید از قیاس ہے کہ کوئی عربی دان شخص اس پوری حدیث کو پڑھے (جس میں بالفاظ صریح مبادلہ کی شرائط بیان کی گئی ہیں) اور اس کا مفہوم یہ سمجھے کہ اس سے مبادلہ موقوف کر کے بیع بواسطۂ زرِ مسکوک کو رواج دینا مقصود ہے۔

اسی قسم کی شان تحقیق کا اظہار پردہ کے مسئلہ میں بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً دعوی یہ ہے کہ عہد نبوی میں

پردہ کا رواج نہ تھا۔ اس کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہجرت کے موقع پر انصار کی لڑکیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا تھا۔ حالانکہ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ لڑکیاں جوان جوان تھیں اور آج کل کی ساڑیوں اور بلاؤز جیسے لباس پہن کر گھروں سے نکل پڑی تھیں تب بھی اس واقعہ سے اس مسئلہ میں کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ واقعہ عین ہجرت کے موقع کا ہے اور پردہ کے احکام ہجرت کے بہت بعد نازل ہوئے ہیں۔

دوسرا ثبوت یہ پیش کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتیں بے پردہ آکر بیعت کرتی تھیں لیکن احادیث میں کہیں بھی یہ تصریح نہیں کہ عورتیں بے پردہ آتی تھیں، البتہ بخاری، مسلم اور نسائی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے محض بذریعہ کلام دور ہی سے بیعت لیتے تھے اور بیعت کی غرض سے بھی ان کے ہاتھ کو مس کرنا پسند نہ فرماتے تھے۔ بلاشبہ احادیث میں یہ ارشاد نبوی ضرور آیا ہے کہ کم من کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ یوم القیمۃ (بہت سی ایسی عورتیں ہیں جو دنیا میں لباس پہنے ہوئے ہیں مگر قیامت کے روز برہنہ ہونگی) اور ایک دوسرا فرمان نبوی ہے کہ نساء کاسیات عاریات مائلات ممیلات لا یدخلن الجنۃ ولا یجدن ریحھا (بہت سی عورتیں جو لباس پہنے پر بھی ننگی رہتی ہیں اور مردوں کی طرف مائل ہوتی اور ان کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں وہ جنت میں داخل نہ ہوں گی اور اس کی ہوا تک ان کو نصیب نہ ہوگی) لیکن ان احادیث سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ عورتیں حضور کی مجلس میں ایسے لباس پہن کر آنے کی جرأت کیا کرتی تھیں جنکے اندر سے ان کے جسم جھلکتے ہوتے تھے۔ اس قسم کا ایک ہی واقعہ شاذ حضور کی مجلس میں پیش آیا ہے جس پر حضور نے ایسی سخت تنبیہ فرمائی تھی کہ کسی کو پھر اس طرح آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس واقعہ کو ماضی استمراری کے صیغہ میں بیان کرنے کے تو یہ معنی ہیں کہ ایسا ہوتا رہتا تھا، حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

اس سے زیادہ بے ثبوت بلکہ خلاف واقعہ یہ بات ہے کہ عہد نبوی میں عورت اور مرد ایک ہی صف میں نماز پڑھتے تھے۔ بخاری میں حضرت انس سے یہ روایت آئی ہے کہ ان کے مکان میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کھڑے ہوئے، مقتدی صرف تین تھے یعنی حضرت انس، ایک یتیم لڑکا اور حضرت انس کی والدہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کو بیٹے کے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی اجازت نہ دی اور وہ پیچھے تنہا کھڑی ہوئیں۔ بخاری ہی میں حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے بعد کچھ دیر ٹھیر جاتے یہاں تک کہ پیچھے کی صفوں سے تمام عورتیں اٹھ کر چلی جاتیں۔ پھر آپ اور دوسرے مرد باہر نکلتے۔ مردوں اور عورتوں کا ایک صف میں خلط ملط ہو کر نماز پڑھنا تو درکنار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تو عورتوں کا مسجد میں آنا بھی پسند نہ تھا۔ چنانچہ ابو داؤد میں حضرت ابن عمر سے یہ روایت منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تمنعوا نساءکم المساجد وبیوتھن خیر لھن۔ (اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے نہ روکو اگرچہ ان کا گھروں میں نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے) پھر ان کو مسجد میں آنے کی اجازت بھی عام نہ تھی بلکہ صرف رات کے لیے تھی۔ بخاری میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے حضور نے فرمایا۔ اذا استاذنکم نساؤکم باللیل الی المسجد فاذنوا لھن (بخاری، باب خروج النساء الی المساجد باللیل والغلس) حضرت عائشہ رض کی روایت ہے کہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے صبح بہت سویرے اپنی چادروں میں ڈھکی چھپی جاتی تھیں اور واپسی کے وقت اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ کوئی ان کو پہچان نہ سکتا تھا۔ اس پر مزید حکم یہ تھا کہ مسجد میں خوشبو لگا کر نہ جائیں۔ موطا میں امام مالک نے حضور کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ اذا شھدت احداکن صلوۃ العشاء فلا تمسن طیبا (جب تم میں سے کوئی عورت عشا کی نماز میں شریک ہو تو خوشبو نہ لگائے) تعجب ہے کہ ان میں سے کوئی حدیث بھی پروفیسر سیادت علی صاحب کو نہ ملی اور نہ معلوم کہاں سے یہ غیر معروف اطلاع مل گئی کہ حضرت عمر کے عہد تک مسلمان عورتیں مسجدوں میں مردوں کے ساتھ ایک ہی صف میں پہلو بہ پہلو کھڑی ہو کر نماز پڑھا کرتی تھیں۔

آخری ثبوت جو عہد رسالت میں پردہ کا رواج نہ ہونے کے باب میں پروفیسر صاحب نے پیش فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ مراسم حج میں آج تک بھی یہ "ضروری" ہے کہ میدان عرفات میں عورتیں بے نقاب کھڑی رہیں۔ یہ مسئلہ ہم کو حدیث یا فقہ کی کسی کتاب میں نہیں ملا، اور نہ کسی حاجی نے اس کی تصدیق کی حیدرآباد میں مطوّفین بکثرت آتے رہتے ہیں اور مناسک حج کے جزئیات پر ان سے زیادہ کسی کو عبور نہیں ہوتا۔ پروفیسر سیادت علی صاحب کو اگر کتابوں سے مراجعت کرنے کا موقع نہ ملا تھا تو اس بات کو پبلک میں بیان کرنے سے پہلے کم از کم کسی مطوّف ہی سے دریافت کر لینا چاہیے تھا۔

سود اور پردہ کے باب میں جس انداز تحقیق سے کام لیا گیا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا۔ اب طلاق کے مسئلہ کو بھی ملاحظہ کیجئے پروفیسر سیادت علی صاحب نے تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ اس راز کا انکشاف فرمایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے طلاق السنۃ یعنی "قرآن و حدیث کے مقرر کردہ طریق طلاق کو بدل کر طلاق بدعی کو رائج کر دیا" اور جو طلاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بائن نہ تھی اس کو اپنے اختیار سے بائن قرار دیا۔ تقریر کے اس حصہ کو جب ہم پڑھ رہے تھے تو دفعتاً ہمارے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کے بعد شائد یہ فقرہ آئے گا کہ جب حضرت عمرؓ نے ایسا کیا تو مدینہ میں ہنگامہ برپا ہوا اور حضرت عمرؓ قتل کر دیے گئے۔ کیونکہ وہ زمانہ ایسا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کی آنکھیں دیکھے ہوئے لوگ ہزارہا کی تعداد میں موجود تھے، اور ان کی موجودگی میں کوئی شخص یہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ قرآن و حدیث کے احکام میں تغیر و تبدل کرے، اور خدا اور رسول کے احکام کی رو سے جو عورت اپنے شوہر سے جدا نہ ہوئی ہو اس کو اپنے حکم سے جدا کر دے!

لطف یہ ہے کہ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے حضرت عمر کے اس فعل کی جو توجیہ فرمائی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے طلاق بدعی کو رائج نہیں کیا بلکہ لوگوں میں یہ بدعت رواج پا رہی تھی، اس لیے آپ نے اس کو رد کرنے کے لیے سزا کے طور پر یہ فرمایا کہ جو شخص اپنی بیوی کو بیک وقت

بتن طلاق دے گا اس کی بیوی اس سے جدا کردی جائے گی۔ اس مسئلہ کو جس طریقہ سے ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے طلاق بدعی کی فقہی حیثیت اور اس کے بارے میں فقہاء کے اختلافات اور مختلف مذاہب کے استدلالات کا مطالعہ کیا ہی نہیں۔

طلاق کے مسئلہ میں سب سے زیادہ عجیب بات جو ڈاکٹر صاحب نے فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ آئندہ سے طلاق دینے کا حق شوہر سے چھین کر قاضی یا پنچایت کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ یہ تجویز دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا تو ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کی وہ آیات سرے سے پڑھی ہی نہیں جن میں طلاق دینے کا اختیار بلا شرکت غیرے صرف مرد کو دیا گیا ہے، یا اگر ان کو پڑھا ہے تو ڈاکٹر صاحب قاعدہ لاینکر و التغیر الاحکام بتغیر الازمان کی رو سے اس بات کے قائل ہیں کہ تغیر زمانہ کے ساتھ قرآن مجید میں بھی ترمیم کی جا سکتی ہے! ہمیں نہیں معلوم کہ وہ ان دونوں شقوں میں سے کون سی شق اختیار کرنا پسند فرماتے ہیں۔ (باقی)

مکتبۂ علمیہ

سلطنت آصفیہ میں یہ ایک ایسا مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتب اور ان کے تراجم مل سکتے ہیں طلباء کے لیے درسی کتب کا بھی انتظام کیا گیا ہے بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جاسکتی ہیں جو مصنفین و مولفین حیدرآباد میں اپنی تصانیف کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہوں وہ مہتمم مکتبہ سے ذریعہ خط و کتابت جملہ امور کا تصفیہ فرما سکتے ہیں حیدرآباد کے مشہور اور نامور شعراء اور مصنفین کی تصانیف آپ کو مکتبہ ہی سے مل سکتی ہیں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر فہرست مفت **مالک خواجہ بہاء الدین صاحب مکتبۂ علمیہ چارمینار حیدرآباد دکن** طلب فرمائیے۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی انکو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیک نمبر اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کے لیے مضامین و حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

مینجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(مطبوعہ معظم جاہی پریس چارمینار حیدرآباد دکن) (دکن)

اُردو زبان کی ایک پرشکوہ کتاب

تمدن عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے اڈیشن ۱۸۹۸ء

کی جو صفحہ بصفحہ جامع مع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۴۵) امیرکن بلاک (۶۵۱) صفحے اعلیٰ کاغذ
نفیس چھپائی، بہترین سنہری جلد فرانس کے مایۂ ناز مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی مگر ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن (مدظلہ) کے

جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی حجہ سنہ ۱۳۵۴ھ تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت ۳۰ روپیے بعد طبع ۳۵ روپیے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادرۂ روزگار کتابوں کے لیے

سید عبدالقادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن کا (پتہ یاد رکھیں)